نگار

قیمت فی کاپی ۱۰ر

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے و ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔

قیمت تین روپیہ

علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جسمیں حسن زبان قدرت بیان اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئیگا ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے

قیمت چار روپیہ

علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جسمیں تاریخ اور انشا لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں، حضرت نیاز کی انشا نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ

علاوہ محصول

مختارات نیاز

حضرت نیاز فتحپوری کے افسانوں کا چوتھا مجموعہ، اس میں اکثر و بیشتر وہ افسانے شامل ہیں جو دوسری زبانوں سے لئے گئے ہیں اور اپنی دلچسپی و افادیت کے لحاظ سے خاص درجہ رکھتے ہیں۔ اس مجموعہ کے مطالعہ سے آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ دوسرے زبانوں کے افسانے کیونکر اپنی زبان میں لینا چاہئے کہ وہ ترجمہ نہ معلوم ہوں، مجلد، نہایت عمدہ طباعت و کاغذ اور نفیس گرد پوش کے ساتھ قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ

مکتوبات نیاز

دو حصوں میں

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل نئی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں، اس اڈیشن میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کر دیا گیا ہے اور ۲۶ پونڈ کاغذ پر طباعت ہوا ہے۔

قیمت ہر حصہ تین روپیہ

علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان و تخیل اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشا عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ

علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا

شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام خطری اور غیر فطری قسموں کے حالات اور ان کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کہاں سے کس کس طرح پھیلی ہوئی نیز یہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا اڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مجموعۂ استفسار و جواب

(حصہ ۲ - ۳)

اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بے کار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان دونوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسایل شامل ہیں اور اس کی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلوپیڈیا کی ہے۔

قیمت فی جلد تین روپیہ

علاوہ محصول

جھانسی کی رانی

نیاز فتحپوری کے قلم سے اس ڈرامہ سے نہ صرف ۱۸۵۷ء کے ان واقعات پر روشنی پڑتی ہے جو ہندوستان میں برطانوی راج کے قیام کا باعث ہوئے، بلکہ راجاؤں کے ان اندرونی اختلافات کا بھی حال معلوم ہوتا ہے جو ملک کو غیر ملکیوں کے ہاتھ میں دیدینے کا بڑا سبب تھے اس ڈرامہ کے دو حصے خصوصیت کے ساتھ بہت دلچسپ ہیں جن میں رانی کی زندگی کے آخری لمحات کا حال بیان کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپیہ چار آنہ

اصحاب کہف

یہ ڈرامہ ایک مصری انشا پرداز "توفیق الحکیم" کی کتاب "اہل الکہف" کا ترجمہ ہے جس میں فاضل مصنف نے نہایت لطیف انداز سے "اصحاب کہف" کی روایت پر عاقلانہ تبصرہ کیا ہے، اس تمثیل کی جان وہ حصہ ہے جہاں موضوع محبت پر گفتگو کی گئی ہے اور اس کی ابدیت کو بالکل اچھوتے انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ ترجمہ حضرت نیاز نے کیا ہے۔

قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ

زیب دیتا ہے اسے جسقدر اچھا کہئے

مرزا غالبؔ نے یہ مصرع بادشاہ کے ہاتھ میں
چکنی ڈلی دیکھ کر کہا تھا مگر دُنیا آج کل اسے

نکٹائی عرق مدد

مال استعمال کر کے پڑھتی ہے

ہر قسم کا زردہ، مشکی قوام، دانہ الائچی، تیل، عطر، عرق کیوڑہ و گلاب اور مختلف قسم
کے پان مسالوں کو مشرقی نفاست اور طبّی احتیاط کے ساتھ طیار کرنے والا
مشرقی ہندوستان کا قدیم ترین کارخانہ آپ کی فرمائشات کا منتظر ہے

فہرست طلب فرمایئے

ٹیلی گرام: "مشکی قوام ہوڑہ" ٹیلی فون: "ہوڑہ ۴۵۵"

نکٹائی برانڈ زردہ فیکٹری۔ ۱۴۱ ہوڑہ روڈ۔ ہوڑہ

فاسد مادہ کے بغیر

جراثیم مرض پیدا نہیں کر سکتے

خون صاف رکھنا نہایت ضروری ہے

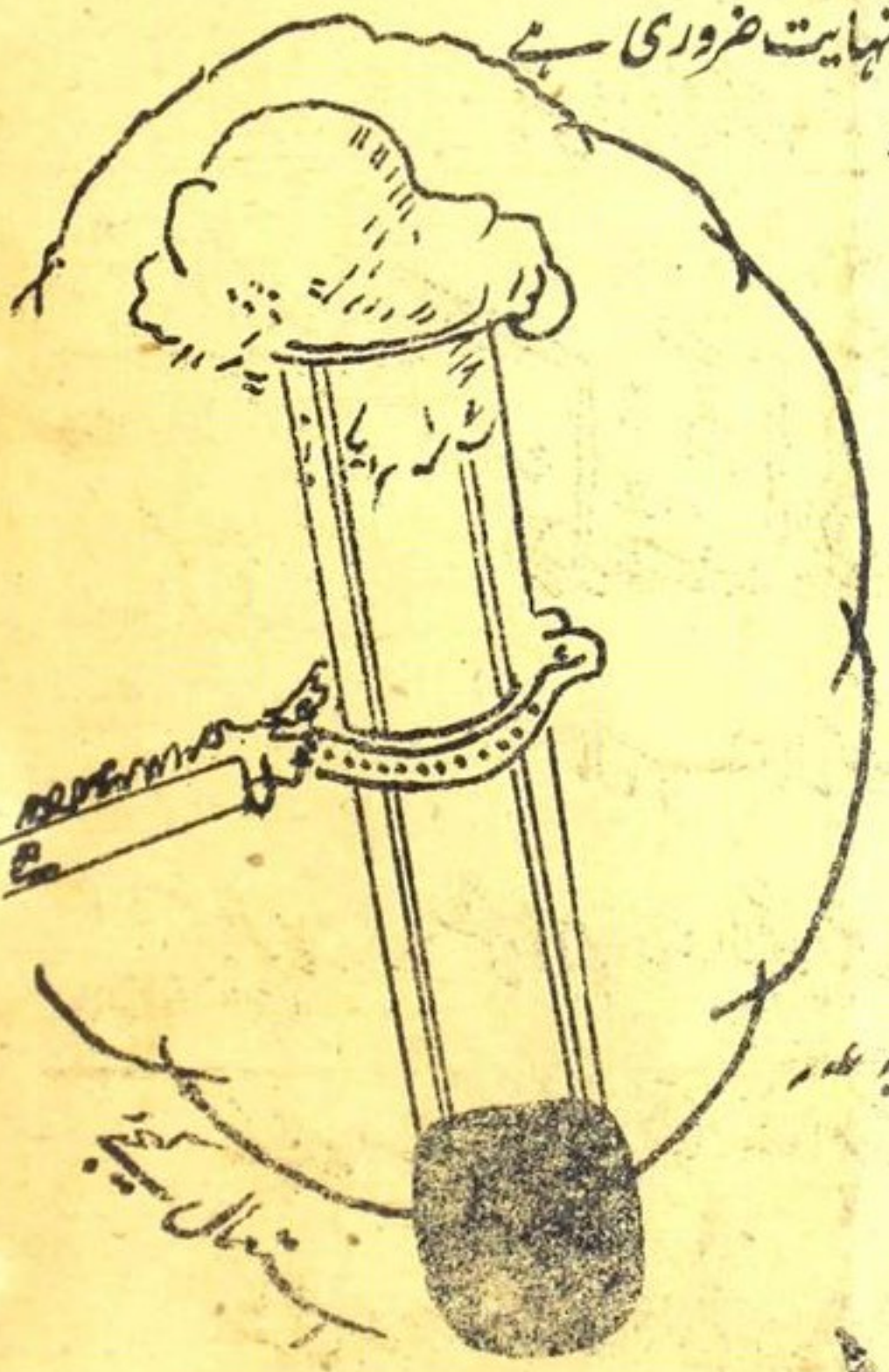

قدیم یونانی نظریہ کی تائید میں جب ڈاکٹر اسپیکوفر پروفیسر دیانا یونیورسٹی نے فیصلہ کر لیا کہ مادہ کے بغیر جراثیم مرض پیدا نہیں کر سکتے تو ایک دن انھوں نے ایک عجیب و غریب مظاہرہ کیا وہ کلاس پڑھا رہے تھے، اُن کے ہاتھ میں ایک ٹیسٹ ٹیوب تھی جس میں ہیضہ کے زندہ جراثیم موجود ہے، جو ایک پوری رجمنٹ کو ہلاک کرنے کے لئے کافی تھے۔ ڈاکٹر نے ان سب جراثیم کو نگل لیا، مگر اس خطرناک تجربہ کا نتیجہ سوائے ہلکی سی تکلیف کے اور کچھ نہ ہوا، آخر کیوں؟ ہیضہ کے زندہ جراثیم نے ڈاکٹر کو ہلاک کیوں نہیں کر ڈالا! صرف اس لئے کہ ڈاکٹر کا خون فاسد مادوں سے صاف تھا

اور یہی ڈاکٹر کا دعویٰ تھا

یقیناً جراثیم کو مارنا قطعاً غلط ہے اصل چیز جسم و خون کو فاسد مادوں سے صاف رکھنا ہے۔ **صافی** اسی اُصول کے پیش نظر طیار کی گئی ہے یہ خون کو صاف رکھتی ہے اور جسم کی قوت مدافعت کو مرض کے خلاف قوی بناتی ہے۔

قیمت فی شیشی ایک روپیہ عہ،

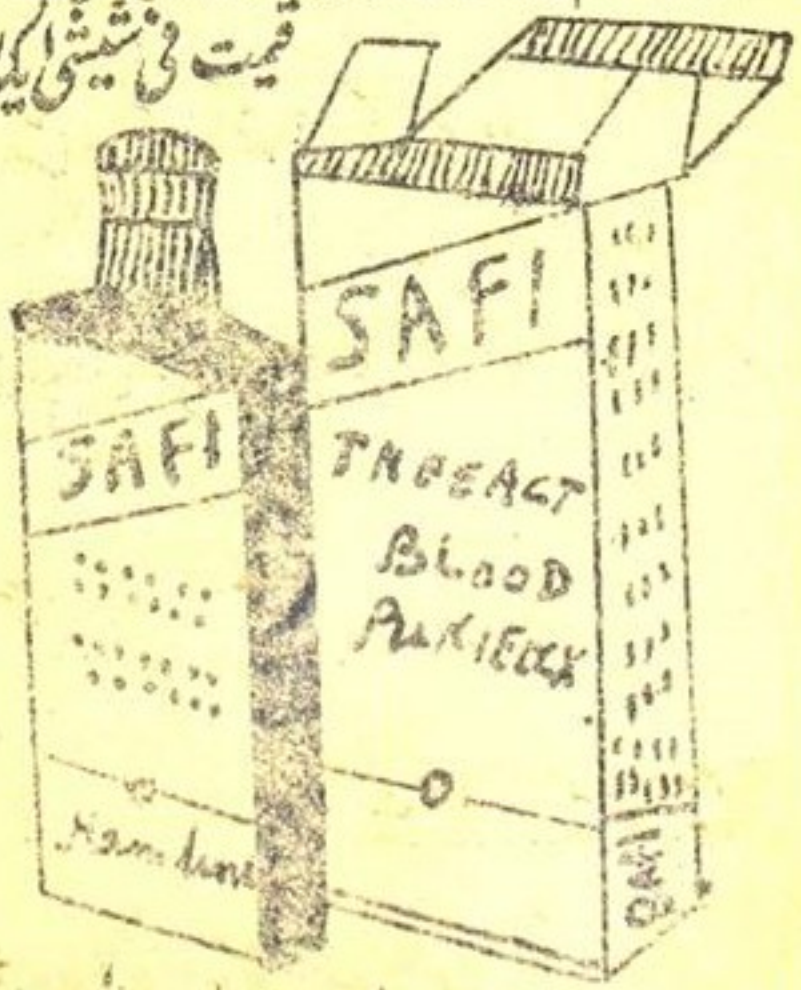

صافی

Hamdard

ہمدرد دواخانہ دہلی

خون صاف کرنے کی قدرتی دوا

"نگار" کا سالانہ چندہ اب چھ روپیہ علاوہ محصول ہوگیا ہے

سالانہ چندہ: چھ روپیہ ہندوستان کے لئے

نگار

بیرون ہند کے لئے بارہ شلنگ

جلد-۵۳ | فہرست مضامین مارچ سنہ ۴۸ء | شمار-۳

ملاحظات ---------- ۵
فانی کی المیہ شاعری کے عناصر --- ذوقی (ام-اے) --- ۹
امریکہ و جاپان کا ردعنی اتحاد ---------- ۱۵
یادرفتگاں ---------- محمد عظیم ---------- ۱۸
دُنیا کا دائمی امن وسکون ---------- ۲۸
دُرگا باقی بعنم ---------- خواجہ احمد فاروقی ام-اے --- ۳۱
برطانیہ کا اقتصادی بحران ---------- ۳۶
انشائیہ قصیدہ گوئی کی حیثیت سے --- رحمت نبی خاں ام-اے --- ۳۹
مکتوبات نیاز ---------- ۴۷
سمجھ میں نہ آنے والے واقعات ---------- ۵۰
باب المراسلہ ---------- ۵۳
معلومات عامہ ---------- ۵۶
منظومات --- درد - سرشار - ادیب - عرشی - خزاں - رتنا --- ۵۸
مطبوعات موصولہ ---------- ۶۱

حضرت نیاز فتحپوری کی ایک بے مثل تصنیف

"من و یزداں"

جو اپنی انشا عالیہ اور پرزور خطیبانہ تحریر کے لحاظ سے معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتی ہے ---------- اور

اخلاقی تعلیمات کے لحاظ سے اتنی بلند ہے کہ اُسے صحیح معنی میں

انجیل انسانیت

کہہ سکتے ہیں۔

اس میں مذاہب کی تخلیق، خدا کے تصور، رسالت کے مفہوم دینی عقاید اور کتب الہامی کی حقیقت پر بسبط تاریخی، علمی، نفسیاتی اور اخلاقی بحث کی گئی ہے۔

حجم ۲۷۰ صفحات، کاغذ سفید و دبیز، جلد خوشنما۔ قیمت علاوہ محصول سات روپیہ آٹھ آنہ (بعہ)

سالانہ چندہ چھ روپیہ ہندوستان کے لئے۔ بیرون ہند کے لئے بارہ شلنگ

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۵۳	مارچ سنہ ۴۸ ۶	شمار ۴

آہ، مہاتما گاندھی

اَرَاَیْتَ مَنْ حَمَلُوْا عَلَی الْاَعْوَادِ
اَرَاَیْتَ کَیْفَ خَبَا ضِیَاءُ النَّادِیْ

(تم نے دیکھا کہ یہ کس کو لکڑیوں پر اُٹھا کر لے گئے۔ اور تم نے یہ بھی دیکھا کہ مجلس کی روشنی کس طرح ٹھنڈی پڑ گئی)

ملاحظات

مہاتما گاندھی کی شخصیت

حکومت کے خلاف ہندوستانیوں کی تمدنی و سیاسی آزادی حاصل کرنے کے لئے مہاتما نے سب سے پہلے جنوبی افریقہ میں اپنی جدوجہد شروع کی، جہاں برطانوی حکومت و برطانوی آبادی نسلی امتیاز کی بناء پر ہندوستانیوں کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کرتی تھی اور اس سلسلہ میں ۱۸۹۳ء اور ۱۹۱۳ء کے درمیان مہاتما کو آٹھ بار جیل جانا پڑا اور معمولی مجرموں کے ساتھ انھیں رکھا گیا۔

اس کے بعد جب وہ ہندوستان آئے تو ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۹ء تک انھوں نے برطانوی حکومت کے ساتھ تعاون کر کے ملک کی آزادی کے لئے جدوجہد شروع کی، لیکن جب انھیں بالکل یقین ہو گیا کہ برطانوی حکومت ہندوستان کو اپنی خوشی سے کبھی آزاد نہیں کر سکتی اور ملک کا جہل و افلاس اس حکومت کے ہوتے ہوئے کبھی دور نہیں ہو سکتا تو انھوں نے حکومت کے خلاف عدم تعاون کی پالیسی اختیار کی اور ۱۹۱۹ء اور ۱۹۴۴ء کے درمیان ان کو آٹھ مرتبہ قید و بند کی تکلیفیں اُٹھانا پڑیں۔ آخری مرتبہ جب ۱۹۴۴ء میں انھیں مقید کیا گیا تو ان کی عمر ستر سال سے زیادہ ہو چکی تھی، لیکن انھوں نے ان تمام مصائب کو نہایت صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کیا، کیونکہ وہ اپنی جگہ فیصلہ کر چکے تھے کہ برطانوی سامراج کی لعنت کو بہرحال دور کرنا ہے اور یہ لعنت محض اخلاقی قوت سے دور ہو سکتی ہے جس کا دوسرا نام اہنسا ہے۔

اُن کے سامنے برطانوی سامراج کی پچھلی سو سال کی تاریخ موجود تھی اور اس میں انھیں کسی ایک جگہ بھی اس قوم کی انسانیت و اخلاق کی کوئی جھلک نظر نہ آتی تھی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ انگریز کی نگاہ میں ہندوستانی جانور سے بدتر ہے اور ایک سفید فام قوم ہونے کی حیثیت سے وہ اپنے آپ کو اس کا مستحق سمجھتا ہے کہ ہندوستان کی سیاہ فام آبادی کو ہمیشہ اپنا غلام بنائے رکھے، اور ان کے ملک کو لوٹ کر تباہ و برباد کر دے۔ مہاتما کا یہ احساس اس قدر قوی تھا اور اُن کے تاثرات اس درجہ شدید تھے کہ حصولِ مقصود میں جتنے زیادہ موانع پیدا ہوتے جاتے تھے، اتنی ہی زیادہ ان کی جدوجہد بڑھتی جاتی تھی اور یہ ان کی انھیں بے غرض کوششوں کا نتیجہ تھا کہ آخرکار ہندوستان کی تمام آبادی نے بلا قید ملت و مذہب برطانوی سامراج کو ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا اور برطانیہ کو اس فیصلہ کے سامنے سر جھکا دینا پڑا۔

مہاتما گاندھی اس میں شک نہیں مذہباً ہندو تھے، لیکن ان کے مذہبی معتقدات کی بنیاد رسم و رواج پر نہیں بلکہ محض اخلاق پر قایم تھی جہاں پہونچکر دُنیا کے تمام مذاہب کی راہیں ایک ہو جاتی ہیں، اس لئے وہ نسل و مذہب کے امتیاز سے بہت بلند تھے اور دُنیا میں وہ محض اخوتِ عامہ اور انسانیتِ کبریٰ کی حکومت چاہتے تھے، اور اپنے اسی بلند مقصد کی تکمیل میں انھوں نے اپنی جان دی۔

جنھوں نے مہاتما گاندھی کی زندگی اور اُن کے خلوصِ عمل کا مطالعہ کیا ہے، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ ان کے اندر پیمبرانہ روح کام کر رہی تھی اور ایک پیمبر ہی کی حیثیت سے ان کو اہلِ ملک نے دیکھا، لیکن سوال یہ ہے کہ اب جبکہ ان کی ذات ہم میں موجود نہیں ہے، ہم کو کیا کرنا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ دُنیا سے جب کوئی نبی، پیغمبر یا عظیم المرتبت انسان اُٹھ گیا تو اس کی تعلیمات کی اصل روح بھی کچھ دنوں بعد ختم ہو گئی اور اسکے ماننے والے محض مراسم و عوائد کے پابند ہو کر رہ گئے، اور اگر مہاتما گاندھی کے بعد بھی یہی ہوا تو گو کوئی نئی بات نہ ہوگی، لیکن سخت افسوسناک ہوگی۔

مہاتما گاندھی کی ہستی اس میں شک نہیں ایک رشی و منی کی ہستی تھی۔ انکے بُت شوالوں میں رکھے جائیں گے، ان کا نام سمرنوں پر جپا جائے گا، ان کے چرے کارے اگائے جائیں گے اور جب کسی صحبت میں ان کا ذکر آئے گا تو لوگوں کے سر جُھک جائیں گے، لیکن کیا اس سے مہاتما گاندھی کی روح کو کوئی مسرت حاصل ہو سکتی ہے اور کیا ہم کو کوئی فایدہ اس سے پہونچ سکتا ہے، اگر ہم ان کی تعلیمات کو نظر انداز کر دیں۔ اُنکے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ امر یا غیر فانی ہو گئے، لیکن انسان کا جسم کبھی امر نہیں ہوتا، بلکہ اس کی روح امر ہوتی ہے اور ہم مہاتما گاندھی کے امر ہونے کا ثبوت صرف اسی طرح دے سکتے ہیں کہ ان کی تعلیمات کو سامنے رکھیں اور جس مقصد کو وہ ناتمام چھوڑ گئے ہیں اسے پورا کر کے دکھا دیں۔

مہاتما گاندھی بڑے خوش نصیب انسان تھے کہ ہندوستان کو وہ اپنے سامنے ہی آزاد دیکھ گئے جسکی ان کو انتہائی تمنا تھی، لیکن اس آزادی سے انھیں جو دُکھ پہونچے ان کی تمنا انھوں نے کبھی نہ کی تھی۔ حصولِ آزادی اور تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں جو قیامت کبریٰ برپا ہوئی، اس نے مہاتما گاندھی کے دل کا خون کر دیا تھا اور وہ سفاکی و درندگی، بیرحمی و شقاوت کے واقعات سُن سُن کر اس درجہ ملول رہنے لگے تھے کہ ان کو اپنی زندگی عار نظر آنے لگی تھی اور اسی لئے انھوں نے برت رکھا تھا کہ شاید وہ اس طرح اس لعنت گاہ سے منھ چھپا سکیں گے لیکن ان کی قسمت میں تو اس سے زیادہ شاندار، اس سے زیادہ دلکش موت لکھی تھی، اُن کو تو اکابر شہدار عالم کی صف میں شامل ہونا تھا، اُن کے مقدس خون کو تو اس ملعون سرزمین کے گُناہوں کا کفارہ ہونا تھا، اس لئے ان کی زندگی کا مقصود جو واقعی برت سے پورا نہ ہو سکتا تھا، آخر کار ریوالور کی گولی سے پورا ہوا۔

پھر اس میں شک نہیں کہ مہاتما گاندھی کی یاد قایم رکھنے کے لئے وہ سب کچھ ہوگا، جو اس مادی دُنیا میں کیا جا سکتا ہے، انکے مجسمے قایم ہوں گے، اُن کے بُت پوجے جائیں گے، ان کے نام سے مدرسے اور ادارے قایم ہوں گے اور ہو سکتا ہے کہ ایک جداگانہ مسلک و مذہب ہی گاندھی پنتھی کے نام سے جاری ہو جائے، لیکن اُن کی صحیح یادگار صرف وہی ہو سکتی ہے جو ہمارے دلوں میں، ہماری روحوں میں قایم ہو اور اُنکے سچے معتقد و پیرو وہی ہو سکتے ہیں جو ان کی طرح اپنی زندگی کو صرف درسِ محبت و اخوت کے لئے وقف کر دیں، مذاہب کے موجودہ اختلافات سے کٹ کر صرف "مذہبِ انسانیت" کو اپنا مذہب قرار دیں، صرف اس لئے کہ خود ہماری بقاء و نجات اسی میں ہے، ورنہ جہاں تک مہاتما گاندھی کی شخصیت کا سوال ہے وہ ان تمام یادگاروں سے بے نیاز ہے اور صفحاتِ تاریخ پر اس کا یہ قایم کیا ہوا نقش کبھی نہیں مٹ سکتا کہ

مشتِ خاکے و بصد گونہ ہوسے و تربت!
تواں شناخت کہ ایں خاک مردمی خیزد

مہاتما گاندھی کی شخصیت ایک ایسے انسان اعلیٰ کی شخصیت تھی، ایک ایسے زبردست مفکر و مصلح کی شخصیت تھی جس میں پہاڑوں کا سا تحمل و استقلال اور دریاؤں کا سا اضطراب حرکت و عمل پایا جاتا تھا۔ ان کا مذہب صرف محبت تھا، جب تک وہ زندہ رہے انھوں نے ہمیشہ یہی درس دیا اور اگر دُنیا کو صحیح امن و سکون نصیب ہو سکتا ہے تو صرف اسی درس کو سامنے رکھکر جسکی تبلیغ میں مہاتما گاندھی نے جان دی۔ سچ ہے:۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
چمن میں جب کہیں ہوتا ہے جاکر دیدہ ور پیدا

کانگرس اور کانگرس حکومت کی غلطیاں

اس میں شک نہیں کہ تقسیم ہند کا بنیادی سوال صرف اس خدشہ سے متعلق تھا کہ مسلمان ہندوستان میں جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے آزادی اور عزت کے ساتھ نہیں رہ سکتے اور رفتہ رفتہ یہ خیال قوی ہوکر پاکستان کے تعمیری منصوبہ میں تبدیل ہوگیا۔ ہر چند اس تحریک کو پیدا کرنے، ترقی دینے اور آخر کار کامیاب بنانے میں برطانوی سامراج کی چالوں کو بڑا دخل تھا، جس نے مسلم لیگ کے ذریعہ سے ہندوستان کے اتحاد کو ختم کیا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس تحریک کو قوی بنانے کے ذمہ داری ایک حد تک کانگرس پر بھی عاید ہوتی ہے، جس نے یہ سب کچھ سمجھتے ہوئے کہ در پردہ اس تحریک کا بانی کون ہے، اس خدشہ کو بڑھ جانے کا موقعہ دیا اور اپنے طرز عمل میں مصلحتاً و ضرورتاً بھی کوئی ایسی تبدیلی پیدا نہیں کی کہ اس خدشہ کا پروپاگنڈا کرنے والوں کا منہ بند کر دیا جاتا۔

یہ تو تھی کانگرس کی پہلی غلطی جس کا احساس ممکن ہے اسے کبھی ہوا ہو، لیکن اس کا اعتراف اسنے کبھی نہیں کیا۔ اس کے بعد دوسری بڑی غلطی اس نے یہ کی کہ "تقسیم ہند" کے مسئلہ کو تسلیم کرلیا۔ اس باب میں لارڈ مونٹ بیٹن نے جو کچھ کیا وہ یقیناً ان کی زندگی کا بڑا کارنامہ ہے اور برطانوی حکومت انکے اس خدمت کو کبھی فراموش نہیں کرسکتی کہ جس بات کی وہ عرصہ سے متمنی تھی اور پوری نہ ہوتی تھی اسے لارڈ مونٹ بیٹن نے اتنی آسانی سے طے کردیا، لیکن خود کانگرس نے کیوں اس کو تسلیم کرلیا، اس کا کوئی معقول جواب کانگرس کے پاس نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ قبل تقسیم ہند عارضی حکومت کے دوران میں جو موانع کانگرس کی راہ میں حایل کئے گئے، اُن سے وہ تنگ آگئی تھی اور آخر کار اسنے پریشان ہوکر تقسیم کے مسئلہ کو تسلیم کرلیا۔ اگر یہ صحیح ہے تو میں اسے کانگرس کی کمزوری سے تعبیر کروں گا، کیونکہ مجبور ہوکر کسی بات کو مان لینا کسی قوم یا حکومت کا قابل فخر کارنامہ نہیں ہو سکتا۔ اگر ان غلطیوں کا سلسلہ یہیں ختم ہوجاتا تو بھی غنیمت تھا، لیکن افسوس ہے کہ وہ تقسیم کے بعد بھی جاری رہا۔ اگر کانگرس نے اُصولاً پاکستان کے قیام کو تسلیم کرلیا تھا، تو چاہئے تھا کہ مالی، اقتصادی و انتظامی امور میں تقسیم کی جو صورتیں طے پاگئی تھیں ان پر وہ شگفتگی و خندہ روئی کے ساتھ عمل کرتی، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان کے ساتھ اسکے تعلقات زیادہ کشیدہ ہوگئے۔ اور۔ اگر مہاتما گاندھی کا قدم درمیان نہ ہوتا تو ۵۰ کروڑ کی رقم کے معاملہ میں یہ کشیدگی غالباً نازک صورت اختیار کرلیتی۔ اتفاق سے اسی دوران میں کشمیر کا جھگڑا شروع ہوگیا اور اس سلسلہ میں جو غلطی کانگرس سے ہوئی وہ تمام پچھلی غلطیوں سے زیادہ خطرناک ہے۔ مہاتما گاندھی اس کے موافق نہ تھے کہ اس مسئلہ کو حفاظتی کونسل کے سامنے پیش کیا جائے، لیکن نہرو حکومت نے رفع شر کی یہی صورت زیادہ مناسب سمجھی، حالانکہ اسے جاننا چاہئے تھا کہ اس طرح مسئلہ کشمیر اور زیادہ اُلجھ جائے گا، پاکستان کی خواہش

بھی یہی تھی کہ یہ مسئلہ حفاظتی کونسل کے سامنے جائے، لیکن وہ خود اپنی طرف سے اس کی ابتدا کرنا مناسب نہ سمجھتا تھا، وہ چاہتا تھا کہ اسکی تحریک ہندوستان کی حکومت کی طرف سے ہو اور پاکستان ایک مدعا علیہ کی حیثیت سے جوابدہی کرے۔ کیونکہ قاید اعظم ایسا ماہر قانون یہ نکتہ نظر انداز نہ کرسکتا تھا کہ عدالت میں مدعا علیہ جوابدہی کے لئے کس قدر آزاد ہوتا ہے اور شبہات سے فایدہ اُٹھانے کا اس کو کتنا موقعہ حاصل ہوتا ہے، خاصکر ایسی صورت میں جبکہ خود عدالت مدعا علیہ کی حمایت پر آمادہ ہو۔

پھر کیا ہندوستان کی حکومت اس حقیقت سے واقف نہ تھی کہ حفاظتی کونسل برطانیہ و امریکہ کی Power Politics کے سوا کچھ نہیں اور پاکستان کا وجود اور اس کا استحکام، برطانیہ و امریکہ کی مشترکہ پالیسی کے لحاظ سے کس قدر ضروری ہے۔ اور اگر وہ اس سے واقف تھی (اور یقیناً واقف ہوگی) تو کیوں اس نے دیدہ و دانستہ ایسی غلطی کی۔ اس کا کوئی معقول جواب نہیں دیا جاسکتا۔

کشمیر کا علاقہ اپنے جارو قوع کے لحاظ سے بڑی اہم چیز ہے، اس کا شمالی علاقہ روس کے جنوبی سرحد سے ملا ہوا ہے اور بحر ہند پر اقتدار قایم کرنے کے لئے (جس کی تمنا روس کو عرصہ سے ہے) روس یہیں سے پیشقدمی کرسکتا ہے، اس لئے وہ چاہتا ہے کہ یا تو کشمیر میں خود اس کے قدم جم جائیں یا پھر ہندوستان کے زیر اثر آجائے جہاں کبھی نہ کبھی کمیونسٹ حکومت ہوجانے کا اسے یقین ہے، برخلاف اسکے برطانیہ و امریکہ، کشمیر پر اپنا اثر قایم رکھنا اسلئے ضروری سمجھتے ہیں کہ خلیج فارس کے پٹرول اور بحر ہند کی حفاظت اسی طرح ممکن ہے کہ کشمیر کسی ایسی حکومت کے سپرد کردیا جائے جو اینگلو امریکن پالیسی کے لحاظ سے زیادہ موزوں ہو، اور ظاہر ہے کہ ایسی حکومت پاکستان ہی کی ہوسکتی ہے۔ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے بیس سال تک برٹش کامن ولتھ میں شامل رہنے کا مستحکم وعدہ کرلیا ہے، اور جو جنگ کی صورت میں انگریزی اور امریکن فوجوں کا مرکز آسانی سے بن سکتا ہے۔

اسوقت تک حفاظتی کونسل کی جو روداد ہمارے سامنے آئی ہے، وہ حکومت ہند کے نقطۂ نظر سے بہت امید شکن ہے اور برطانوی و امریکی مندوبین کا رجحان پاکستان کی طرف اب کوئی راز نہیں رہا، لیکن اس سے قطع نظر ایک گتھی اور بھی ہے، وہ یہ کہ اگر حفاظتی کونسل کوئی فیصلہ کر بھی دے تو اس کا نفاذ کیونکر ہوگا اور اس کے پاس وہ کونسی قوت ہے جو اپنے فیصلہ کو پاکستان و ہندوستان دونوں سے تسلیم کرالیگی اور اگر یہ دونوں مان بھی لیں تو سرحدی قبایل کو کیونکر رام کیا جاسکتا ہے اور روس کی طرف سے اسلحہ کی فراہمی کس طرح بند کیجا سکتی ہے

الغرض کشمیر کا مسئلہ بہت اُلجھا ہوا مسئلہ ہے اور ہندوستان کی حکومت نے حفاظتی کونسل میں اسے پیش کرکے اپنے کو اور زیادہ اُلجھن میں ڈالدیا ہے، کیونکہ اس سے نہ صرف ہندوستان و پاکستان کے تعلقات میں اور زیادہ کشیدگی پیدا ہوجائے گی بلکہ حکومت ہند کو اب اپنی خارجہ پالیسی میں بھی تبدیلی کرنا پڑے گی اور اگر اسے برٹش کامن ویلتھ سے علٰحدہ ہونا پڑا، جس کے آثار نمایاں ہیں تو اس کو لامحالہ روس سے تعلقات قایم کرنا پڑیں گے اور بحالات موجودہ جبکہ روس، امریکہ کے درمیان جنگ کا اندیشہ روز بروز قوی ہوتا جارہا ہے، اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہندوستان کو بہت جلد لڑائی کی اس آگ میں کودنا پڑے گا جو بہت تیزی سے مشرق وسطیٰ کی طرف بڑھتی آرہی ہے۔

فانی کی المیہ شاعری کے عناصر

شاعرانہ افتادِ طبع اور مزاج کے لحاظ سے اصغر اور فانی زندگی کی دو بالکل مخالف سمتوں کے حدود پر کھڑے نظر آتے ہیں اور غالباً یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ حسرت ان دونوں کے درمیان حد فاصل کا کام دیتے ہیں۔ اصغر کے یہاں نشاط ہی نشاط ہے۔ فانی کے یہاں غم ہی غم اور حسرت کے یہاں نشاط و غم کا ایک ایسا حسین امتزاج جس کے سموئے ہوئے نکھار میں عشقیہ شاعری کی روح اپنے حقیقی روپ میں کارفرما نظر آتی ہے۔

اصغر نے تو یہ کہہ کر معاملہ بڑی حد تک صاف کر دیا ہے کہ "جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا" لیکن فانی کے یہاں حزن و یاس کے جو عناصر پائے جاتے ہیں ان کا تجزیہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا بظاہر نظر آتا ہے۔ اس شدید، خالص اور غیر مخلوط غم کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جو فانی کی شاعری میں موجیں مارتا ہے یہ امتیاز کرنا تقریباً محال ہے کہ اس میں کہاں "غمِ جاناں" ہے اور کہاں "غمِ روزگار" فانی کا غم اتنا تیکھا اور اتنا پختہ ہے کہ اسے کسی دوسرے سہارے کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ہم ایسا کیوں محسوس کرتے ہیں کہ فانی کے غم حیات کی فضا میں محدود ہیں اور اس میں آفاقی شان نہیں پائی جاتی۔ غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جس غم پر فانی کی شاعری کی بنیادیں قایم ہیں وہ حقیقی اور جذباتی ہونے کے بجائے زیادہ تر تخیلی اور ذہنی ہے۔ اگرچہ فانی کے کلام پر بھی دوسرے کامیاب شاعروں کی طرح اُن کی شخصیت کی چھاپ پڑی ہوئی ہے لیکن یہ خصوصیت یاد رکھنے کے قابل ہے کہ فانی کی شخصیت، ماحول اور حادثاتِ زمانہ کے ہاتھوں تشکیل پانے کے بجائے زیادہ تر خود انھیں کی ساختہ پرداختہ ہے۔ فانی اپنے کلام ہی کے نہیں بلکہ بڑی حد تک اپنی شخصیت کے بھی خالق ہیں۔ یہ بات سننے والوں کو کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہوگی۔ لیکن فانی کی زندگی کے تفصیلی حالات کی چھان بین کے بعد جس کا فانی کے وطن میں رہ کر حسنِ اتفاق سے مجھے کافی موقع ملا ہے، یہ نکتہ آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ فانی کی شدید غم پرستی اور الم پسندی کے اسباب اُن کی زندگی کے واقعات میں نہیں بلکہ خود اُن کی انوکھی افتادِ طبیعت میں تلاش کرنے چاہئیں۔

غور فرمایئے فانی ایک خوش حال گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ یہ گھرانہ بدایوں میں اپنی امارت اور شرافتِ نسبی دونوں کے لئے مشہور تھا۔ فانی نے نوجوانی ہی نہیں ڈھلتی ہوئی جوانی تک کی تمام زندگی دولت اور راحت کی چھاؤں میں بسر کی

سینتیس برس کی عمر تک صاحبِ جائداد اور برسرِ روزگار، باپ کا سایہ سر پر رہا جس نے اُس زمانہ کے بلند ترین معیار کے مطابق، مسلمانوں کی سب سے مشہور درسگاہ علیگڈھ کالج میں رکھ کر انھیں اعلیٰ ترین تعلیم دلوائی۔ کہا جاتا ہے کہ فانی اپنے شہر کے تیسرے مسلم نوجوان تھے جس نے بی، اے کی ڈگری حاصل کی۔ پھر والد کے انتقال پر ایک عالی شان محل نما مکان کے علاوہ ۵-۶ سو روپیہ ماہوار آمدنی کی جائداد ہاتھ آئی۔ یہ اس ٹھوس سرمایہ کے علاوہ تھی جو وکالت کی سند کی شکل میں پہلے سے ان کے پاس موجود تھا۔ لیکن معلوم ہوتا تھا کہ جیسے فانی کو یہ فراغت کاٹے کھاتی ہو۔ تھوڑے ہی دنوں میں ناقابلِ اسراف کی بدولت اپنی آبائی جائداد کے وارے نیارے کر دئے۔ وطن سے طبیعت بیزار ہوگئی تو وکالت کے سلسلہ میں اٹاوہ، آگرہ، لکھنؤ اور خدا جانے کہاں کہاں کی خاک چھانی لیکن عالم یہ تھا کہ اُن کی بیقرار طبیعت انھیں کہیں زیادہ دنوں جم کر بیٹھنے نہ دیتی۔ یہ نہ سمجھئے گا کہ وکالت کی سرد بازاری انھیں ایک شہر چھوڑ کر دوسرے شہر کیلئے رختِ سفر باندھنے پر مجبور کرتی تھی۔ جی نہیں۔ واقعات شاہد ہیں کہ وہ جہاں جاتے اُن کے کمال کا شہرہ اُن سے پہلے وہاں پہونچ جاتا اور بہت جلد اُن کی شاعری ایسے ہمدردوں کا ایک گروہ پیدا کر لیتی جو اُن کے پیشے کو ہر طرح چمکانے کی سعی بلیغ کرتے۔ فانی کے ایک ہموطن نے جو اُن کے گہرے دوست رہ چکے ہیں اور جنھیں مدتوں سفر و حضر میں فانی کی ہمنشینی کا فخر حاصل رہ چکا ہے مجھ سے خود بیان کیا کہ وہ جس شہر میں بھی جا کر وکالت شروع کرتے وہاں تھوڑے ہی دنوں میں اپنے کمال شاعری کی بدولت افسروں کے منظورِ نظر بن جاتے اور اُن میں سے بعض وارفتگانِ ادب کی ہمدردی کا تو یہ عالم تھا کہ اپنی عدالت کے ملزموں کو بہ اصرار فانی کو اپنا وکیل قرار دینے پر آمادہ کرتے۔ پھر یہ بھی نہ تھا کہ فانی کی ذہانت صرف اُن کی شاعری تک محدود ہو۔ جن بزرگوں نے فانی کو مقدمات کی پیروی کرتے دیکھا ہے وہ اُن کی حیرت انگیز قانونی ذکاوت اور غیر معمولی سوجھ بوجھ کے آج تک قصیدہ خواں ہیں۔

بدایوں کے ایک دوسرے فاضل دوست کا فانی کے متعلق بیان ہے کہ "اُن کے نزدیک گھر سے کچہری تک جانا اتنی بڑی مصیبت تھی کہ مختانے کی کوئی رقم اس کا بدل نہ ہو سکتی تھی چنانچہ بارہا ایسا ہوا کہ کچہری کے قصد سے دروازے تک آئے، دھوپ کی تمازت دیکھ کر العظمت للہ کہا اور پھر گھر میں واپس چلے گئے۔ اٹاوہ میں ایک ڈپٹی کلکٹر اُن کے بڑے قدرشناس تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ فانی کو احتیاج کی صورت نہ دیکھنی پڑے۔ چنانچہ ایک اردلی کی مستقل خدمت یہ تھی کہ فانی کو گھر سے کچہری تک پہونچا دے ــــ آگرے میں ایک سب جج فانی کے بڑے مداح تھے یہاں تک کہ وہ ہر مشاعرے میں جہاں فانی کو بُلایا جاتا شرکت کرنا اپنا فرضِ منصبی سمجھتے تھے۔ اُن کا معمول تھا کہ ہر کمیشن فانی کے سپرد کر دیتے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک ایک ماہ میں چودہ چودہ سو کے کمیشن فانی کو دئے گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہم پیشہ وکلا نے افسرانِ بالا کو شکایتیں لکھنا شروع کر دیں لیکن نہ حکام کی نوازشیں فانی کے افلاس کا علاج کر سکیں نہ احباب کی فہمائشیں۔"

فانی کے والد کا انتقال ۱۹۱۷ء میں ہوا۔ اسوقت فانی کی عمر لگ بھگ ۳۷ سال کی تھی۔ ۳۷ سال کی اس طویل مدت

میں فانی کو جو کچھ بننا یا بگڑنا تھا وہ بن یا بگڑ چکے تھے اور اُن کی طبیعت اور اُن کا شعور پختگی کے تمام منازل طے کر چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں جو اوپر بیان کئے گئے غمِ روزگار کا سوال ہی سرے سے پیدا نہیں ہوتا تھا۔ رہا غمِ جاناں سو داخلی اور خارجی شواہد سے صرف ایک آدھ اوچھی سی چوٹ کا پتہ چلتا ہے، محض ایک خراش جو شاعر کی زندگی پر رعنائی اور رنگینی کا ہلکا سا پرتو تو ضرور ڈال سکتی ہے لیکن دل کا خون نہیں کر سکتی۔

پھر یہ تنگ و تار، روح کو گھوٹ دینے والا، سانس کو بند کر دینے والا غم فانی کی شاعری میں کہاں سے آیا۔ جیسا میں پہلے عرض کر چکا ہوں اس کے سوتے خود فانی کی ذات میں تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک کھاتے پیتے خاندان میں ایک نارمل قسم کا ذہین بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کا بچپن، نوجوانی، جوانی سب کے سب خارجی حوادث اور ماحول کے لحاظ سے بالکل نارمل انداز میں گزرتے ہیں۔ فطرتاً وہ رومان پسند اور سیماب صفت ہے۔ اس کی تیز ذہانت نے اس کے احساس کو دھار دار بنا دیا ہے۔ اُس کی بے چین طبیعت اپنی جولانیوں کے لئے ایسے سنگلاخ زمین کی تلاش میں ہے جس کے تصادم سے اس کا شیشۂ دل چور چور ہو جائے، لیکن اُس کی یہ آرزو تخیل کے حدود سے آگے نہیں بڑھتی۔ اس کی زندگی عملی طور پر اس قسم کے المناک واردات سے خالی ہے جو اپنے ساتھ سوز و گداز کا رنگین تحفہ لاتے ہیں۔ وہ اس پُرسکون، مطمئن اور سادہ زندگی سے بیزار ہو جاتا ہے، کچھ تو اس وجہ سے کہ اس کی بے چین طبیعت ایک گہرے، پائدار داغِ غم کی آرزو مند ہے اور کچھ اس لئے بھی کہ وہ جو اُس کی روح میں ایک شاعر بیٹھا ہوا ہے وہ اس نکتہ سے خوب واقف ہے کہ جس شاعری کو آنسوؤں سے نہ سینچا جائے، جس شاعری کی رگوں میں خونِ جگر رواں دواں نہ ہو وہ شاعری سستی اور ادنیٰ درجے کی ہوتی ہے۔ جب باہر کی دُنیا سے وہ حسب دلخواہ غم کی جراحتیں حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے تو اپنے ہی ناخن سے اپنے سینے کو زخمی کر کے لہولہان بنا دیتا ہے۔ اپنے ہاتھوں اپنے جگر کو اس طرح خون کر کے اسے بڑی لذت حاصل ہوتی ہے۔ وہ خوش ہے کہ جس نعمت سے وہ اب تک محروم تھا وہ اُسے مل گئی اور بڑی بات یہ کہ اس خود اکتسابی دولت غم کے لئے اسے زندگی کا بھی احسان مند نہ ہونا پڑا۔ اس خیال سے اسے بڑی تسکین ہوتی ہے کہ یہ اس کی خالص اپنی ہی مشقت کی گاڑھی کمائی ہے جس کے لئے وہ کسی دوسرے کا مرہون منت نہیں۔

سچ پوچھئے تو فانی کی اس نوع کی غم پرستی دراصل لذتیت کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے۔ یہ لذتیت مثبت نہیں بلکہ منفی قسم کی ہے اور ماہرین نفسیات اس نکتے سے خوب واقف ہیں کہ جب نفس انسانی اس قسم کی معکوس لذتیت میں مبتلا ہو جاتا ہے تو پھر اس کی ساری دُنیا سمٹ کر لذت کے ایک چھوٹے سے نقطے میں محدود ہو جاتی ہے۔

خراش کو زخم اور زخم کو کھرچ کھرچ کر ناسور بنا دینے میں فانی کو کمال حاصل ہے، زندگی کی جن ہلکی پھلکی اور وقتی ناکامیوں پر سے ہم آپ یہ سمجھ کر سرسری طور پر گزر جاتے ہیں کہ حیات کی اسی دھوپ چھاں کا نام دُنیا ہے، فانی کی غم پرست طبیعت چھوٹی چھوٹی گریز پا ناکامیوں اور مایوسیوں کو مصائب کا اٹل پہاڑ بنا دیتی ہے اور ان ذہنی جراحتوں سے

حاصل کیا ہوا غم اُن کے لئے روحانی غذا کا کام بہم پہونچاتا ہے۔

فانی کے نزدیک "قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں"۔ اسی لئے وہ زندگی پر موت کو ترجیح دیتے ہیں اور بڑے اہتمام کے ساتھ، طرح طرح سے موت کا شاندار خیر مقدم کرتے نظر آتے ہیں۔ موت انھیں دُلھن اور محبوب کی طرح حسین معلوم ہوتی ہے اور لے دے کے موت ہی انھیں اپنی تمام امیدوں اور آرزوؤں کا آخری سہارا نظر آتی ہے، اس رنگ کے چند اشعار سنئے:۔

اجل کی آرزو ہو دل میں فانی اور دُنیا ہو — خدا رکھے یہی رونق ہے اس اُجڑے ہوئے گھر کی

آتی رہے گی خیراب اس زندگی کو موت — یہ تو ہوا کہ موت مری زندگی ہوئی،

زندگی بھی تو پشیماں ہے یہاں لاکے مجھے — ڈھونڈھتی ہے کوئی حیلہ مرے مرجانے کا

یاس نے درد ہی نہیں، حق تو یہ ہے دوا بھی دی — فانی نامراد کو موت کا آسرا دیا

ہے موت ہی اک زندگی دل کا سہارا — جینے کی جو ایسی تمنا ہے تو مرحبا،

آپ نے دیکھا۔ ان اشعار کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر خود اپنی لاش اپنے کاندھے پر اُٹھائے اُٹھائے پھر رہا ہو۔ ایک ہی جذبے کی الٹ پلٹ کر مختلف زاویوں سے نمایش کی گئی ہے۔ اسی طرح فانی کا تقریباً سارا کلام زندگی کے ایک ہی رُخ کو پیش کرتا ہے جسے پڑھ کر صاف ظاہر ہونے لگتا ہے کہ شاعر کی زندگی اصلی اور قدرتی مصائب کے بھرپور غم سے محروم ہے اور وہ اس کمی کو خیالی اور شاعرانہ غم کے ذریعہ پورا کرنے کی کوشش میں اپنے آخری سانس تک کی بازی لگا دیتا ہے۔

اس سے یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ مجھے فانی کے خلوص سے انکار ہے۔ فانی اپنے کو مظلوم سمجھتے ہیں اور انھیں اپنی مظلومیت کا گہرا یقین ہے۔ پھر اس یقین کے بعد فانی کی صداقت شعری کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

فانی خود اپنے غم کے تصور میں اتنا مگن رہتے ہیں کہ انھوں نے کبھی نگاہ اُٹھا کر کائنات کے غم پر نظر نہ ڈالی۔ اس لئے فانی کا غم محدود اور ذاتی ہے اور سماجی حیثیت سے بھی اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

فانی کے یہاں غالب کا حُسنِ بیان اور میر کا حزن و یاس دونوں چیزیں پائی جاتی ہیں اور ایمان کی بات تو یہ ہے کہ جہاں تک الفاظ میں اظہارِ غم کے سلیقہ کا تعلق ہے ان کی شاعری کئی جگہ میر سے بھی آگے بڑھ گئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہمیں اُن کی شاعری میں وہ جذبۂ البلاغم، وہ دُکھتا ہوا تڑپتا ہوا سوز و گداز نہیں ملتا جو میر کے کلام کی جان ہے۔

میر کے غم و یاس کے اردگرد ہمیں ایک وسیع ہالہ سا نظر آتا ہے جس میں ناکامی و نامرادی، حسرت و آرزو کی ایک دُنیا آباد ہے لیکن فانی کے غم میں ہر طرف ویرانی ہی ویرانی نظر آتی ہے۔ میر کے غم میں زندگی، حرکت اور تازگی ہے۔ فانی کا غم اُداس، تاریک اور بے رس ہے۔ میر جب کہتے ہیں:۔

دل کے ویرانے کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر گزرا

تو ہمارے سامنے ایک پوری کی پوری لٹی ہوئی دُنیا کا از سر نو نقشہ جم جاتا ہے اور خدا جانے کتنی چلتی پھرتی تصویریں، جوق در جوق اور قطار در قطار آنکھوں کے سامنے آکھڑی ہوتی ہیں۔ لیکن فانی کے مجرد غم کے پیچھے ہمیں کوئی دوسری چیز نظر نہیں آتی۔ یہاں آرزوؤں، امیدوں اور ناآسودہ حسرتوں تک کا نشان نہیں۔ یاس کی ایک اتھاہ، سمندر کے مانند گہری، اُداس تاریکی ہے جس میں نہ تموج ہے نہ حرکت، جہاں نہ امروز ہے نہ فردا۔ ایک بھیانک، افسردہ اور بے پایاں رات جس کی کوئی صبح نہیں، جب فانی یقین دلانے والے لہجے میں کہتے ہیں:

ہر نفس آہ، اور انفاس پہ جینے کا مدار، زندگی آہ مسلسل کے سوا کچھ بھی نہیں

تو یہ ساری کائنات اور اس کا جیتا جاگتا نظام ایک بے حقیقت فریب نظر آنے لگتا ہے، عالم اور اس کی تمام وسعتیں نگاہ سے اوجھل ہو جاتی ہیں اور تھوڑی دیر کے لئے ہم سوچنے لگتے ہیں کہ کیا واقعی دُنیا اتنی ہی بے حقیقت، اتنی ہی محدود اور اتنی ہی چھوٹی سی ہے جیسی کہ شاعر سمجھتا ہے۔

فانی کا جذبۂ غم کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو، ہمیں یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ اُن کی جذباتی دُنیا کا دائرہ بہت تنگ ہے۔ ان کی شاعری میں نہ حسرت کی ہمہ گیر جمال پرستی کی رنگا رنگ دلکشی ہے اور نہ اصغر کی حکیمانہ رعنائی خیال۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم اُن کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ان کی شاعرانہ شخصیت ان دونوں کے مقابلے میں کچھ بھنچی بھنچی سی کچھ یکرخی سی نظر آتی ہے۔ وہ جو شاعر کی ساحرانہ شخصیت میں ایک قسم کی وسعت، ایک طرح کی بڑھنے، پھیلنے اور چھا جانے کی شان نظر آتی ہے وہ ہمیں فانی کے یہاں نہیں ملتی۔

فانی غم کے اس قدر حریص ہیں کہ اُس سے کسی طرح ان کی نیت سیر ہی نہیں ہوتی، جہاں غم نہیں ہوتا وہاں اُنکی اذیت پسند طبیعت خود اسے پیدا کرلیتی ہے اور وہ ہمیشہ نت نئے غم کی آرزو میں مبتلا نظر آتے ہیں۔

اپنے دیوانے پر اتمام کرم کر یارب در و دیوار دئے اب انھیں ویرانی دے

فانی شدید طور پر تقدیر پرست واقع ہوئے ہیں۔ انسانی زندگی ان کے نزدیک جبرِ مشیت کا ایک ہولناک زنداں ہے جہاں کی قید و بند زنجیر کی بھی مرہون منت نہیں۔

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں، ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں،

پھر کہتے ہیں:

دیکھ فانی وہ تری تدبیر کی میت نہ ہو جا رہا ہے اک جنازہ دوش پر تقدیر کے

میں جب اس شعر کو پڑھتا ہوں اور فانی کے واقعات زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے۔ ایک طرف فانی کی حد سے بڑھی ہوئی خودداری، دولت سے درویشانہ بے نیازی، پیشہ کی جانب سے شدید بے پروائی اور مالی حالت سدھارنے کی تمام

تدبیروں سے بیزاری کے واقعات ہیں اور دوسری طرف ان کا عقیدے کی حد تک مضبوط یقین کہ مشیت اُن کی تمام تدبیروں کو خاک میں ملا دینے پر تلی ہوئی ہے اور انھیں ایک قدم بھی اپنی مرضی کے موافق نہیں چلنے دیتی۔

میری تدبیروں کی مشکل اب تو یارب سہل کر　　کیا یہ ساری عمر منھ تکتی رہیں تقدیر کا

ذرا یہ مشکل سے سمجھ میں آنے کی بات ہے کہ جہاں تدبیر کے معاملہ میں ایک سری سے سناٹا ہی سناٹا ہو وہاں تقدیر کو مورد الزام بنانا کہاں تک قرین انصاف ہے۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ فانی ایک بہت بڑے فن کار تھے۔ زبان کو نوک و پلک سے آراستہ کرنے اور الفاظ کو نرم و لطیف ترنم بخشنے میں فانی کو کمال حاصل تھا۔ وہ الفاظ برتنے کے معاملہ میں انتخاب کا ایسا رچا ہوا سلیقہ رکھتے تھے جس کی مثال دوسرے شاعروں کے یہاں کم نظر آتی ہے۔ الفاظ کی دھیمی موسیقی اور سبک شیرینی نے اُن کے کلام کو وہ حسن کارانہ دلکشی عطا کی ہے جس سے حقیقی سوز و گداز کے فقدان کی یک حد تک تلافی ہو جاتی ہے۔ فانی کے یہاں لفظ اور خیال کی ایسی مربوط ہم آہنگی پائی جاتی ہے کہ اُن کا تقریباً سارا کلام بھرپور شعریت سے معمور نظر آتا ہے۔ اُن کا شعر سُن کر ہمارے سینے سے آہ نکلے یا نہ نکلے، مُنھ سے بے ساختہ "واہ واہ" ضرور نکل جاتی ہے۔ اُن کا کلام تمام تر رواں دواں، چست اور مضبوط ہے۔ انھیں اظہار خیال پر حیرت انگیز قدرت حاصل ہے، فانی صحیح اور موزوں الفاظ کے انتخاب میں اس قدر تلاش اور کاوش برتتے ہیں اور اپنے اشعار کو بنا سنوار کر کچھ ایسے سجل روپ میں پیش کرتے ہیں کہ ان کی سج دھج ہمیں بالکل محو کر دیتی ہے اور تھوڑی دیر کے لئے شاعر کی بے مصرف قنوطیت پر کسی نہایت بلند قسم کے حکیمانہ عرفان کا دھوکا ہونے لگتا ہے۔ انداز بیان کی صناعانہ دلکشی، الفاظ کی خوش سلیقہ سجاوٹ اور اظہار خیال کے خوبصورت اور مترنم انداز نے فانی کی شاعری میں ایک خاص قسم کی تمکنت اور وقار پیدا کر دیا ہے۔ ان کے کلام کا یہ تجمل خارجی اور سطحی نہیں ہے بلکہ شعریت کا حسن الفاظ کے اندر سے گزر کر خیال کے دھارے کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور جب کبھی بھی فانی نے اپنے اندر سمٹنے کے بجائے عقدۂ دل سے باہر نکل کر یا کائنات سے ٹکر لیکر کوئی شعر کہا ہے تو اُنکے کلام میں وہی کچوکے لگانے والی نشتریت، وہی گہری تاثیر وہی تڑپا دینے والا سوز و گداز پیدا ہو گیا ہے جو بہترین تغزل کا سرمایہ امتیاز ہے۔

ذرا ان اشعار پر نظر ڈالئے۔ ان کی بے پناہ تاثیر سے کون اہل ذوق انکار کر سکتا ہے۔

میں نے فانی ڈوبتے دیکھی ہے فیض کائنات　　جب مزاج یار کچھ برہم نظر آیا مجھے

اُن کو شباب کا نہ مجھے دل کا ہوش تھا　　اک جوش تھا کہ محو تماشائے جوش تھا

روح ارباب محبت کی لرز جاتی ہے　　تو پشیمان نہ ہو اپنی جفا یاد نہ کر

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول　　تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دُکھا ہوا

لو تبسم بھی شریک نگہ ناز ہوا　　آج کچھ اور بڑھا دی گئی قیمت میری

امریکہ و حجاز کا روغنی اتحاد

عہدِ حاضر میں جنگ کی کامیابی کا انحصار صرف پٹرول پر ہے اور اسی لئے دُنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جو پٹرول کی زیادہ سے زیادہ مقدار حاصل کرنے پر جان نہ دیتا ہو، اور اسی لئے جس جس حصۂ زمین میں پٹرولی چشمے پائے جاتے ہیں وہ بڑی دولت سمجھے جاتے ہیں اور ان پر اقتدار قایم کرنے کے لئے بڑی بڑی قوتوں میں آویزش ہوتی رہتی ہے۔ ایران کے باب میں روس اور امریکہ و برطانیہ کے درمیان اسی لئے چشمک رہتی ہے کہ وہاں پٹرولی چشمے بکثرت موجود ہیں، عراق سے برطانوی فوجیں اسی لئے نہیں ہٹتیں کہ وہاں کے پٹرول کو وہ ہاتھ سے دینا نہیں چاہتا اور سعودی عرب کو دوست بنانے کی کوشش روس اور امریکہ نے اسی لئے کی تھی کہ وہاں پٹرول کے نئے چشمے دریافت ہوئے ہیں، جس میں روس ناکام رہا اور امریکہ کو کامیابی حاصل ہوئی، لیکن شاید یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ امریکہ نے ابن سعود کو رام کرنے کے لئے کیا کیا تدبیریں اختیار کیں۔ اور خود ابن سعود کو کتنا مالی فایدہ اس اتحاد سے پہونچ رہا ہے۔

سرزمین حجاز میں جو امریکہ نے اپنی نئی پٹرولی کمپنی قایم کی ہے، اس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ دُنیا کی سب سے بڑی کمپنی ہے اور حجاز دنیا کا سب سے بڑا ذخیرہ پٹرول کا رکھتا ہے۔

امریکہ نے ابن سعود سے جو مراعات حاصل کی ہیں اور جن تدبیروں سے ٹھیکہ لیا ہے وہ عہدِ حاضر کی سیاسی چالوں کی عجیب و غریب داستان ہے۔ امریکہ نے ابن سعود کو خوش رکھنے اور عرب آبادی کو قابو میں رکھنے کی جو تدبیریں اختیار کی ہیں ان میں سے ایک ایسے محکمہ کا قیام بھی ہے جس کا کام ہی امریکہ و حجاز کے باہمی تعلقات کو خوشگوار رکھنا ہے۔ اس محکمہ کا وائس پریسیڈیٹ ایک امریکی فلائیڈ اوبلیگر ہے جسے ابن سعود اپنا بیٹا کہتا ہے۔ ابن سعود پر امریکہ و اہل امریکہ کا جتنا اثر ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب امریکہ کے اس درخور و اقتدار کو روس اور دوسری حکومتوں کی طرف سے "امریکہ کے ملوکی اقتدار" سے تعبیر کیا گیا، تو ابن سعود نے کہا کہ "میں اس کمپنی کی ایسی ہی حفاظت کروں گا جیسی اپنی رعایا کی کرتا ہوں"۔

ابن سعود پر یہ اثر قایم کرنے کے لئے کمپنی نے بڑی بڑی ترکیبوں سے کام لیا ہے، چنانچہ گارڈن گیسکل لکھتا ہے کہ "میں نے وہاں کے دوران قیام میں جو کچھ دیکھا اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ کوئی امریکہ کی پٹرول کمپنی ہے یا امریکہ اور عرب کے باشندوں کی ملی جلی سوسائٹی ؟"

امریکہ کے سینیر وائس پریسیڈنٹ جیمس میکفرسن نے ایک بار کہا کہ "ہم عربوں کی مدد کر کے خود اپنی مدد کر رہے ہیں۔ کیونکہ ۲۰۰۵ء میں اس ٹھیکہ کے ختم ہو جانے کے بعد بھی ہم نسلاً بعد نسلٍ اس کی توسیع چاہتے ہیں اور یہ اسی طرح ممکن ہے کہ ہم عربوں سے دوستوں اور عزیزوں کا سا برتاؤ کریں"۔

امریکہ کی پیٹرول کمپنیاں عرصہ سے صحراءِ عرب میں تیل کے چشموں کی جستجو میں تھیں لیکن کوئی عملی قدم نہیں اُٹھایا۔ آخر کار ۱۹۳۳ء میں ابن سعود نے کیلی فورنیا کی اسٹنڈرڈ آیل کمپنی کو ٹھیکہ دیدیا اور ۱۹۳۸ء میں سب سے پہلا چشمہ دریافت کیا گیا۔

سرزمین حجاز کا پٹرول حاصل کرنے کی کوشش ساری دُنیا کی کمپنیاں کر رہی تھیں لیکن کامیابی امریکہ کو ہوئی اور صرف اس لئے کہ اس نے ابن سعود اور عربوں کو خوش کرنے کے لئے اتنا کچھ کیا ہے کہ مسلمان ہونے کے سوا دونوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہا۔

اس وقت کمپنی کے دو ہزار ملازم ہیں اور اتوار کی جگہ سب کو جمعہ کی تعطیل دیجاتی ہے۔ ہفتہ کے باقی ایام میں عرب کارکنوں کو دن میں تین بار نماز پڑھنے کی چھٹی دیجاتی ہے۔ اور ان کے وضو اور مسجدوں کا انتظام بھی کرتی ہے۔

کمپنی کے اسکولوں کے لئے امریکہ سے برنجی گھنٹے آئے تھے، لیکن ان کو صرف اس لئے نہیں بجایا جاتا کہ اہلِ عرب ان کو پسند نہیں کرتے اور کلیسہ کے لئے مخصوص سمجھتے ہیں۔

کمپنی نے ان ملازموں کے لئے جو امریکہ سے آئے ہیں، عربی کی تعلیم مُفت اور لازمی کر دی ہے اور اہلِ عرب، امریکی لوگوں کو عربی بولتے ہوئے سنتے ہیں تو بہت خوش ہوتے ہیں۔ عرب میں تعلیم کا رواج بہت کم ہے لیکن کمپنی نے بہت سے مدارس جاری کر دئے ہیں جن میں ۸ سال سے لیکر ۱۸ سال تک عمر رکھنے والے لڑکوں کو یہاں عربی، انگریزی اور ریاضی وغیرہ کی تعلیم دیجاتی ہے اور جو لڑکے کچھ پڑھ لکھ جاتے ہیں انھیں کام بھی مل جاتا ہے۔

کمپنی کے ان ملازم عربوں کو بھی جو جوان ہیں مُفت تعلیم دیجاتی ہے، چنانچہ اس وقت وہاں ۵۰۰ جوان عربوں کو چھ سال کے نصاب کی تعلیم دیجا رہی ہے اور ان کے رہنے اور کھانے پینے کے تمام مصارف بھی کمپنی برداشت کرتی ہے۔ تعلیم ختم ہونے کے بعد انھیں کمپنی کے تجارتی اسکول میں بھیجا جائے گا اور وہاں وہ جس کام کو پسند کریں گے اسی کی تعلیم انھیں دیجائے گی، اس کے بعد بعض ذہین لوگوں کو امریکہ بھی اونچی تعلیم کے لئے بھیجا جائے گا۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کمپنی ایسے مصارف کر کے خسارہ میں رہے گی، لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے، کیونکہ امریکہ کے رہنے والے ملازم کو یہاں لانے کے لئے کمپنی کو تین ہزار ڈالر صرف کرنا پڑتے ہیں اور یہاں ان کو بڑی بڑی تنخواہیں دینا پڑتی ہیں، اس لئے وہ چاہتی ہے کہ عربوں کو ہر کام کے لئے طیار کیا جائے جو بہت معمولی تنخواہ میں خوش ہو جائیں گے اور اس طرح کمپنی کے مصارف بہت کم ہوں گے۔

اس وقت عرب مزدوروں کے رہنے کے لئے کمپنی نے کھجور کے پتوں کے جھونپڑے طیار کرائے ہیں، لیکن اسکیم یہ ہے کہ پانچ سال کے اندر دو کروڑ ساٹھ لاکھ ڈالر کے لاگت سے ان کے لئے نہایت آرام دہ کوارٹر بنا دئے جائیں، جن میں برقی پنکھے بھی ہوں اور

بجلی کے چولھے بھی، عرب میں سالانہ صرف تین انچ بارش ہوتی ہے اور پانی کی وہاں بہت قلت ہے، لیکن ریت کے نیچے گہرائی میں چھپے ہوئے چشمے وہاں بہت ہیں اور اب کمپنی ریت کی تہوں کو توڑ توڑ کر کنویں طیار کر رہی ہے جن سے مشین کے ذریعہ سے پانی اوپر کھینچا جائے گا اور اس طرح عرب کا خشک ریگستان سبزہ زار ہو جائے گا۔

ریگستان کا ایک بہت بڑا حصہ ایسا تھا جہاں پانچ دن کی مسافت کے بعد بھی اہلِ کارواں کو پانی نہ ملتا تھا۔ اس کمپنی نے اب اسی ریگستان کے وسط میں ایک بہت بڑا کنواں طیار کرا دیا ہے جہاں گرمیوں میں پانچ پانچ ہزار اونٹ بیک وقت پانی پینے کے لئے جمع ہو جاتے ہیں۔

سعودی عرب کا تنہا ذریعۂ آمدنی صرف حجاج کے قافلے تھے جن سے ابن سعود کو زیادہ سے زیادہ ستر لاکھ ڈالر سالانہ کی آمدنی تھی، لیکن اب پٹرول پر جو رایلٹی اسے ملتی ہے اس کی مقدار دو کرور ڈالر ہے جو چند سال کے بعد دوچند ہو جائے گی۔

اس آمدنی سے ابن سعود نے اپنے پایۂ تخت ریاض کے لئے بجلی مہیا کر لی ہے اور جدہ کی سڑکوں کو پختہ بنایا جا رہا ہے، اسی کے ساتھ یہ تجویز بھی ہے کہ وادی فاطمہ سے جو ۵۰ میل دور ہے یہاں پانی مہیا کیا جائے۔

عرب کو اپنے لئے غذا کا سامان تقریباً کل کا کل باہر سے لانا پڑتا ہے، اور ابن سعود اس آمدنی سے چاول، شکر، چاء، قہوہ، کپڑا، لاریاں اور موٹر وغیرہ فراہم کرتا ہے۔ چنانچہ اس وقت وہاں ۳۵۰۰ موٹریں نظر آتی ہیں حالانکہ ۱۹۴۲ء میں ان کی تعداد ۳۵۰ سے زیادہ نہ تھی۔

ابن سعود نے الخرج میں ایک فارم بنایا ہے۔ یہاں ایک بہت بڑا کنواں ہے جس کی گہرائی ۳۰۰ فٹ اور سو فٹ قطر ہے۔ گدھوں کی مدد اور چرخ کے ذریعہ سے ۵۰۰ ایکڑ زمین پہلے بھی اس سے سیراب ہوتی تھی۔ لیکن اب ابن سعود کی فرمایش پر کمپنی نے اس میں چار پمپ لگا دئے ہیں اور فی منٹ سات ہزار گیلن پانی کھینچا جا سکتا ہے۔ کمپنی نے ایک پختہ نہر بھی ۱۰ میل لمبی بنوا دی ہے اور اب تین ہزار ایکڑ زمین کی آبپاشی ہو سکتی ہے۔ ابن سعود نے ایک امریکن شخص کو اس کا مہتمم بنا دیا ہے اور اسوقت الخرج اتنا سرسبز اور زرخیز ٹکڑا ہو گیا ہے کہ وہاں ہر قسم کی ترکاریاں، پھل اور غلہ بکثرت پیدا ہونے لگا ہے۔

اب یہ تجویز بھی سامنے ہے کہ خلیج فارس سے ریاض پایۂ تخت تک ریل جاری کی جائے، اور اس کے مصارف کا تخمینہ تین کروڑ ۲۵ لاکھ پونڈ ہے۔ الغرض اس کمپنی کے اثرات رفتہ رفتہ عرب میں بڑھتے جا رہے ہیں اور سرزمین عرب بھی اپنا چولا بدل رہی ہے خیال کیا جاتا ہے کہ ریاض جس کی آبادی صرف سات ہزار ہے۔ بہت جلد ساڑھے تین لاکھ آبادی کا شہر ہو جائے گا۔

خود کمپنی کی وسعت اور اس کے کاروبار کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۹۴۹ء تک ۵ لاکھ پیپا پٹرول روزانہ نکالا جائیگا اور تقریباً ڈیڑھ ارب ڈالر کمپنی کا صرف ہوگا۔

الغرض سعودی عرب کا مستقبل زرعی و صنعتی حیثیت سے بہت شاندار معلوم ہوتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی یقین ہے کہ عربوں کی روح آزادی سلب ہو جائے گی اور چند سال بعد سرزمین نجد و حجاز، امریکہ کی ایک کالونی ہو کر رہیگی اور عرب، امریکہ کا غلام ہو جائیگا۔

یادِ رفتگاں

مرزا مظہر جانجاناں

کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی فطین (genius) کے کمال پر نظر اعتنا نہیں کی جاتی، لیکن جس چیز کو وہ اپنے لئے باعث ننگ سمجھتا ہے وہی آخر کار اس کی شہرت اور عزت کا باعث بن جاتی ہے۔ مثلاً غالب کو لیجئے، آج ان کی نقشہائے رنگ رنگ کی فارسی کو کوئی نہیں پوچھتا لیکن ان کے بے رنگ مجموعہ اُردو پر سب ہی سر دھنتے ہیں۔ کچھ اسی سے ملتی جلتی مثال مرزا مظہر جانجاناں کی ہے۔ مرزا موصوف بہت بڑے فقیہہ، محدث اور عارف کامل تھے۔ مشہور محدث محمد حیات سندھی کا قول ہے کہ "اگر کوئی حدیث فقیہہ حنفی کے معمول کے خلاف وارد ہو اور مرزا جانجاناں اس حدیث کی توثیق کریں تو اس کے باوجود بھی اس حدیث پر عمل کر لینا چاہئے"۔ لیکن آج مرزا موصوف کا نام صاحب کمال درویش ہونے کی وجہ سے زندہ نہیں۔ ممکن ہے ان کا نام ہماری لوح یاد سے محو بھی ہو گیا ہوتا اگر وہ شاعر نہ ہوتے۔ مرزا پیشہ ور شاعر نہ تھے اور نہ شاعری کو اپنے شایان شان ہی سمجھتے تھے۔ بعض تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ ان کے اُردو کے معدودے چند اشعار جو آج ہمیں ملتے ہیں یہ صرف ان کی جوانی کے کہے ہوئے ہیں اور بعد کو انھوں نے شاعری ترک کر دی تھی۔ ممکن ہے انھوں نے یہ اشعار بھی نہ کہے ہوتے اگر انھیں اپنے نالوں پر اختیار ہوتا یا فریاد کی کوئی دوسری لے مل جاتی جو پابند نے نہ ہوتی۔

مرزا مظہر جانجاناں جتنے بڑے صوفی ہیں اتنے بڑے شاعر نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ان کی زندگی یا دو اہمیت تصوف سے زیادہ ان کی شاعری کی مرہون منت ہے۔ غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر دوسرے فنکاروں کی بہ نسبت جلد مشہور ہو جاتا ہے اور اس کی شہرت خواص یا اس فن کے مخصوص ماہرین تک محدود نہیں رہتی بلکہ ہر مرد عورت، بچہ بوڑھے کے دل و دماغ اس کی آواز سے آشنا ہو جاتے ہیں۔ شاعری ہمارے دل کا راگ ہے۔ یہ دُکھ سکھ میں ہر وقت ہمارے ساتھ رہتی ہے لیکن دیگر علوم و فنون (ادب کی دیگر اصناف بھی) سے ہمیں ایک محدود وقت کے لئے سابقہ پڑتا ہے۔ اس لئے شاعر کی شہرت دیگر فن کاروں کے مقابلہ میں زیادہ وسیع ہی نہیں، زیادہ پائیدار بھی ہوتی ہے۔ اگر ایک ہی شخص بہت اچھا شاعر، سائنسداں، ماہر اقتصادیات یا فلسفی ہے تو اس کے مرنے کے تھوڑے عرصہ بعد ہی ممکن ہے لوگ اس کی دیگر تمام خصوصیات کو بھلا دیں یا اس کا ذکر کسی محدود طبقہ تک محدود ہو جائے لیکن اس کے برخلاف اس کے نغمے خواص و عوام سب کے دلوں کو

گرماتے رہیں گے۔ خیام شاعر ہی نہیں، ریاضی داں بھی تھا۔ لیکن آج شاعر کی حیثیت سے ایک دُنیا اسے جانتی ہے اور ریاضی داں کی حیثیت سے ممکن ہے بہت سے ریاضی داں بھی اس سے ناواقف ہوں۔

مرزا کا اصل نام جانِ جاں ہے اور تخلص مظہر۔ آپ کے والد مرزا جانؔ، عالمگیر کے دربار میں ایک ممتاز عہدہ پر فایز تھے، "نسب ان کا باپ کی طرف سے محمد بن حنفیہ سے ملتا ہے۔ ماں بیجاپور کے شریف گھرانے سے تھیں۔ دادا بھی دربار شاہی میں صاحبِ منصب تھے۔ دادی اسد خاں وزیر کی خالہ زاد بہن تھیں۔ پردادا سے اکبر شاہ کی بیٹی منسوب ہوئی تھیں۔ ان رشتوں سے تیموری خاندان کے نواسے تھے۔" آبِ حیات میں لکھا ہے کہ ۱۱ر رمضان ۱۱۱۱ھ بروز جمعہ (۲۰ر فروری سنہ ۱۷۰۰ء[1]) کو کالا باغ علاقۂ مالوہ میں مرزا کی پیدایش ہوئی۔ جب عالمگیر کو دکن میں خبر پہونچی تو اس نے نومولود کا نام جانِ جاں تجویز کیا۔ چونکہ والد کا نام مرزا جانؔ تھا اور بیٹا باپ کی جان ہوتا ہے اس لئے بیٹے کا نام جانِ جاں ہوا جو کثرت استعمال سے جانجاناں ہوگیا۔ باپ نے شمس الدین نام رکھا لیکن یہ عالمگیری نام کے مقابلہ میں نہ چمکا۔ مگر آزاد کے اس بیان کی کسی اور تذکرہ سے تائید نہیں ہوتی۔ نکات الشعرا سے پتہ چلتا ہے کہ جانِ جاں ان کے والد کا ہی رکھا ہوا نام ہے۔ میر صاحب کے الفاظ یہ ہیں۔ "پدر او مرزا جانِ جاں نام داشت۔ از فرط شفقت جانِ جاں می گفت، ازیں سبب ہمیں اسم موسوم است۔" مرزا موصوف نے حضرت غلام علی آزاد کو جو اپنے سوانح لکھ کر بھیجے ہیں ان سے بھی آزاد صاحب کے بیان کی تصدیق نہیں ہوتی۔ وہ لکھتے ہیں: "فقیر جان جاں متخلص بہ مظہر، پسر مرزا جانؔ، جانیؔ تخلص، علوی نسب، ہندی مولد، نقشبندی مشرب است۔" پھر یہ شمس الدین کہاں سے آیا۔ ممکن ہے آزاد صاحب ہی کا بیان صحیح ہو اور یہ نام ان کے والد ہی کا رکھا ہوا ہو۔ تذکرہ "طور کلیم" کو پڑھکر یہ شبہ ہوتا ہے کہ چونکہ مرزا بہت صاحب کمال درویش تھے اس لئے لوگ القاب و آداب کے ساتھ ان کا نام لکھتے تھے۔ بعد کو انہی القاب و خطابات کو غلطی سے ان کا نام سمجھ لیا گیا۔ تذکرہ "طور کلیم" سے شمس الدین نام نہیں، محض لقب معلوم ہوتا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: "مظہر، قطب الاقطاب، شیخ المشائخ، شمس الدین، حبیب اللہ حضرت مرزا جانجاناں خلف الصدق مرزا جان رحمۃ اللہ علیہما۔" اس شبہ کو "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" کے ضمیمہ سے اور تقویت ہوتی ہے۔ اس میں پروفیسر محمد سرور جامعہ ملیہ لکھتے ہیں: "کہ ان کا پورا نام شمس الدین حبیب اللہ ہے۔" لیکن حبیب اللہ کسی اور تذکرہ سے ثابت نہیں ہوتا اور جس طرح پروفیسر موصوف غلطی سے ان کا نام حبیب اللہ سمجھ بیٹھے ہیں، ممکن ہے اسی طرح آزاد صاحب نے شمس الدین کو ان کا نام سمجھ لیا ہو اور چونکہ لطیفہ گوئی اور واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا ان کی عادت ہے اس لئے شمس الدین کو انھوں نے ان کے باپ کی طرف سے منسوب کر دیا ہو۔ لیکن حیرت تو اس بات پر ہے کہ مولانا عبدالحیؒ اور رام بابو سکسینہ نے بھی اسے جوں کا توں قبول کر لیا۔

اسی طرح آزاد صاحب نے مرزا کی تاریخ پیدایش ۱۱ر رمضان ۱۱۱۱ھ اور جائے پیدایش کالا باغ صوبۂ مالوہ کو قرار دیا ہے۔

---

[1] بمطابق تقویم ہجری وعیسوی شایع کردہ انجمن ترقی اردو۔ لیکن ۲۰ر فروری کو منگل کا دن پڑتا ہے نہ کہ جمعہ کا

لیکن میر صاحب نکات الشعرا میں لکھتے ہیں کہ "اصلش از اکبر آباد است" اور اس کی تصدیق دوسرے تذکروں سے بھی ہوتی ہے۔ فتح علی گردیزی لکھتے ہیں "ادا فہم، معنی پرور، مرزا جان جاناں مظہر، اصلش از معمورۂ بخارا و مولدش و منشاش اکبر آباد ش"۔ گارساں دتاسی انھیں اکبر آبادی لکھتا ہے اور ان کا سن ولادت ۱۱۱۱ھ قرار دیتا ہے اور یہی صحیح ہے کیونکہ اس کی تصدیق خود مرزا کے بیان سے ہوتی ہے:۔

"فقیر جانِ جاں متخلص بہ مظہر پسر مرزا جان، جانی تخلص، علوی نسب، ہندی مولد، نقشبندی مشرب است و در عشرۂ اولیٰ مائۃ ثانیہ بعد الف ولادتش اتفاق افتاد۔ نشو و نمائے ظاہری در بلدۂ اکبر آباد یافتہ تربیت باطنیش در محروسۂ شاہجہاں آباد از جناب سید محمد بدایونی نقشبندی مجددی واقع شد۔ سلسلۂ نسبش بہ بیس و ہشت واسطہ بتوسط محمد بن حنیفہ بہ شیر بیشۂ کبریا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ منتہی می شود۔ جدا علیٰ او امیر کمال الدین در اوائل مائۃ تاسعہ از خطۂ طالقف بہ جذبِ قسمت بحدود ترکستان رخت اقامت انداخت و بفرمانِ روائے بعضے از آں ممالک عمر گزرانیدہ، اولاد کثیرہ بہم رسانید از آنہا امیر مجنوں و امیر بابا در عین فتح ہندوستان کہ بر دست ہمایوں بادشاہ اتفاق افتاد دریں مملکت وارد شدند۔ از آں باز خدمت و رفاقت سلاطین گورگانیہ شعایر مردم ایں خاندان بود میرزا جان مذکور کہ در ششم مرتبہ از امیر بابا در درجۂ دوازدہم از امیر کمال الدین مسطور واقع است بعہد عالمگیر بادشاہ علیہ الرحمۃ بعالی منصب ترک دنیا سرفراز گردید و ایں خاکسار از بدو طفلی ہوائے مال و جاہش زر در سر نہ پیچید۔ بعد تحصیل ضروریات ایں مشت غبار خود را بدامن دولت از خود رفتگان بستہ ہا امید آنکہ چشمے در عالم دیگر باز کند۔ چوں نقش قدم بر در ایشاں نشستہ است از بس دماغش ضعف قوی دارد و تاب تدبیر اسباب نمی آرد۔ و تجرید و تفرید اختیار کردہ۔ نان برخوان دو نان نخورد۔ و چوں گل عمرِ خود را بیک خرقہ بسر بردہ بہ تحریک شورِ عشقے کہ نمک خمیر اوست گاہ بے بفریاد و امی کند و چوں نالہ اش موزوں واقع می شود احباب از راہ جوہر شناسی بہ میزان اشعارش می سنجند۔ وگرنہ او را از غایت انصاف نظر بہ بے سرمایگی خود دکانے برسخن نچیدہ۔ زیادہ بریں نیست کہ نظر بزرگاں یافتہ معنی قبولے بہم رسانیدہ است۔ او سبحانہ حسن خاتمہ ہم نصیب کند"۔

مرزا کے مذکورۂ بالا سوانح سے صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ ان کی پیدائش اکبر آباد میں ہوئی۔ لیکن وہ آگرہ میں کب تک رہے اور ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت کس طرح ہوئی، اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اس باب میں دوسرے تذکرے بھی خاموش ہیں۔ البتہ یہ ضرور معلوم ہے کہ انھوں نے شیخ محمد افضل سیالکوٹی سے حدیث اور مجددی طریقہ سید محمد بدایونی نقشبندی اور امام ربانی کے دوسرے عالی مرتبت پیروؤں سے حاصل کیا۔

سولہ سال کی عمر میں مرزا سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ لیکن ان کی طبیعت فطری طور سے فقر و استغناء کی طرف مائل تھی اس لئے انھوں نے شاہی مناصب کی طرف توجہ بھی نہ کی اور مدرسوں اور خانقاہوں کی جاروب کشی کرتے رہے۔ مولانا عبدالحئی لکھتے ہیں کہ آپ نے تیس برس تک مشائخ نقشبندیہ سے یہ کسب فیض کیا۔ شیخ محسن اپنی کتاب "دبستان" میں امام ربانی کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں کہ ان کے بعد آنے والے ان کے جلیل القدر اصحاب میں سے ایک شخص شمس الدین المظہر معروف بہ

جانجاناں شہید دہلوی ہیں ۔۔۔۔۔۔ اتباع سنت اور کشفی قوت میں آپ کا بلند مقام تھا موصوف کے استاد شیخ سیالکوٹی، امام ولی اللہ اور الحاج فاخرالہ آبادی ایسے ائمہ تصوف اور محدثین نے آپ کے علم وفضل اور جلالت شان کی شہادت دی ہے۔" مرزا کے فقر و توکل اور ان کے عارف کامل ہونے پر سب ہی تذکرہ نگار متفق ہیں اور ان کا نام انتہائی عقیدت اور احترام سے لیتے ہیں۔

میر تقی میر لکھتے ہیں :۔

"مرزا جانِ جاں تخلص ۔ مردیست مقدس، مطہر، درویش، عالم، صاحب کمال، شہرہ عالم، بے نظیر، معزز، مکرم ۔۔۔۔ بندہ بخدمت اورفتہ سعادت اندوز گشتہ است ۔ اکثر اوقات در یاد الٰہی صرف می کند۔"

فتح علی گردیزی لکھتے ہیں :

"حقاکہ ذاتش مظہر تجلیات الٰہی است ومظہر انوار فیوضات غیر متناہی۔"

لچھمی نراین شفیق، غلام علی آزاد کی رائے نقل کرتے ہیں :۔

"مرزا مظہر جانِ جاں سلمہ اللہ تعالیٰ مظہر فیض الٰہی است ومشرق صبح آگاہی، شاہ مسند فقر وغنا، مقیم آستانِ توکل واستغنا، نام والد او مرزا جان است ۔ ازاین جا وجہ تسمیہ او توان دریافت ۔ اما نام وتخلص او گویا عنایت ترجمان اسرار قیومی مولانائے رومی است کہ پانصد سال پیش از این در دفتر ششم مثنوی ارشاد فرمودہ کرامتے نمایاں بہ حضار انجمن استقبال وانمودہ یعنی

جانِ اول مظہر درگاہ شد جانِ جاں خود مظہر اللہ شد

رام بابو سکسینہ رقم طراز ہیں :

"عالم متبحر، فقیہہ کامل، حنفی المذہب اور نقشبندی طریقت تھے ۔ عالم باعمل، احکام قرآن کے پیرو، اکثر وقت اوراد ووظائف یا دلچسپ علمی گفتگو اور شعر وشاعری میں گزارتے تھے ۔۔۔۔ اکثر کرامات بھی آپ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔"

ان کے فقر و استغنا، پر مولانا عبدالحی نے کافی روشنی ڈالی ہے ۔ ہم اس میں سے چند مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں :

"استغنا اور بے تعلقی کا یہ عالم تھا کہ ساری عمر کسی بادشاہ یا وزیر کے سامنے سر نیاز خم نہیں کیا۔ ایک بار محمد شاہ نے نواب اعتماد الدولہ قمرالدین خاں کو بھیج کر کہلا بھیجا کہ اتنا بڑا ملک خدا نے مجھ کو دیا ہے، اس میں سے جو کچھ چاہئے قبول فرمائیے ۔۔۔" ہنس کر فرمایا :۔ "قل متاعُ الدنیا قلیل" ۔ خدا نے ہفت اقلیم کو قلیل فرمایا ہے، پھر ایک اقلیم میں سے ایک ولایت آپ کے حصہ میں آئی ہے وہ کتنی ہے کہ فقیر اس کی طرف ہاتھ بڑھائے ۔

نواب فیروز جنگ نے خانقاہ، مسجد، کنواں، یومیہ اور گاؤں فقرا کے لئے پیشکش کئے، قبول نہ کئے ۔۔۔۔ نواب آصف جاہ نے ایک بار بیس ہزار روپیہ نذر کیا، آپ نے قبول نہیں فرمایا۔"

مرزا کا یہ توکل اور استغنا، واقعی معجزہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے اگر ہمیں اسوقت کی دہلی کی طوائف الملوکی اور لوگوں کی

معاشی تباہ حالی کا پورا پورا اندازہ ہو جائے۔ ۱۶۹۸ء سے ۱۷۸۰ء تک (مرزا کی پیدائش سے ان کی وفات تک) عالمگیر کے بعد اس کے تخت پر نو سلاطین اور رونق افروز ہوئے لیکن انھیں عالمگیر کی سلطنت تو ملی، عالمگیر کی زبردست شخصیت نہ ملی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سلطنت کے لئے اور سلطنت ان کے لئے وبالِ جان ہو گئی۔ ان تمام سلاطین میں سب سے زیادہ حکومت محمد شاہ نے کی لیکن سلطنت کے ٹکڑے بھی سب سے زیادہ اس کے دورِ حکومت میں ہوئے۔ ۱۷۲۴ء میں حسین قلی خاں نے جو عام طور پر نظام الملک اور آصف جاہ کے نام سے مشہور ہے، حیدر آباد میں اپنی آزاد حکومت قایم کر لی۔ سعادت خاں گورنر اودھ بھی خود مختار بن بیٹھا۔ ادھر الہ وردی خاں گورنر بنگال نے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اور ادھر روہیلوں نے روہیلکھنڈ میں اپنی آزاد حکومت بنالی۔ مرکزی حکومت کی کمزوری کی وجہ سے نہ صرف مختلف صوبہ جات کے حکمرانوں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا بلکہ اس پر ہر سمت سے یورش ہونے لگی۔ مرہٹوں نے جنوب سے حملہ کیا تو افغانوں نے شمال مغرب سے۔ ابھی دہلی کی بربادی میں شاید تھوڑی سی کسر باقی رہ گئی تھی کہ نادر شاہ نے ۱۷۳۹ء میں حملہ کیا اور دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ محمد شاہ کے بعد احمد شاہ اور عالمگیر ثانی کے عہد اور خود محمد شاہ کے زمانہ میں احمد شاہ ابدالی نے متعدد بار ہندوستان پر چڑھائی کی اور دہلی اور متھرا کو خوب لوٹا۔ اس کے بعد تو ہر کہ ومہ کی بن پڑی۔ گربۂ مسکیں کے بھی پر نکل آئے۔ جس نے جو چاہا کیا، نہ کوئی داد رس نہ کوئی فریادی۔ جب طوائف الملوکی کا یہ عالم ہو تو لوگوں کی تنگ دستی اور افلاس کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سودا نے اپنے شہر آشوب میں لکھا ہے کہ تجار لوٹ کھسوٹ کے ڈر کے مارے گھر سے باہر نہ نکلتے تھے۔ کسی جنس کا کسی قیمت پر خریدار میسر نہ آتا تھا، حتیٰ کہ اُدھار لینے والا بھی ملازم پیشہ الگ پریشان حال تھے۔ تمام مہینہ نوکری اور جی حضوری کرنے کے بعد بھی تنخواہ ہاتھ نہ لگتی تھی۔ ملاؤں اور طبیبوں کی بھی حکمت کام نہ آتی تھی۔ فقر و تصوف کا زور ہونا ہی چاہئے، لیکن درویشی اختیار کرنا شعرا کا ہدف ملامت بننا تھا[1]۔ بیچارے شاعروں کو کون پوچھتا ہے۔ وہ بلا کھ دلی اور ساکنانِ دلی کے گیت گائیں، لیکن جب تک "کھائیں گے کیا" کا مسئلہ طے نہ ہو، دہلی میں رہنا ممکن نہیں۔ جب کوئی ذریعہ معاش نظر نہ آیا تو انھیں بھی دہلی کو خیرباد کہنا پڑا۔ مظہر کے معاصرین میں میر، سودا، سوز، میر حسن، منت اور حسرت لکھنؤ چلے آئے، قایم، مانڈہ چلے گئے اور فغاں، مرشد آباد۔ جن لوگوں کے پائے ثبات کو لغزش نہ ہوئی ان میں میر درد اور مظہر جانجاناں خاص طور پر مشہور ہیں۔ ایسے وقت میں جبکہ دہلی میں رہنا خودکشی کے مترادف تھا، مرزا کا دلی میں جمے رہنا، کسی کے آگے دست طمع دراز نہ کرنا بلکہ دوسروں کی پیشکش کو بھی ٹھکرا دینا اور اپنے وقار اور خود داری کو قایم رکھنا واقعی اعجاز سے کم نہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا "بہر فراغت شیخ" نہ بنے تھے اور نہ حزن و مایوسی نے ہی درویشی کا لبادہ اوڑھا تھا بلکہ اس کی طرف ان کا فطری میلان تھا۔ والد کی وفات کے بعد اگر وہ چاہتے تو اپنے والد کے منصب کو آسانی سے حاصل کر سکتے تھے لیکن انھوں نے اقبال کے الفاظ میں سپہ کی تیغ بازی پر نگاہ کی تیغ بازی کو

---

[1] سودا کا شعر ہے:- چاہے جو کوئی شیخ بنے بہر فراغت — چھٹتے ہی تو شعرا کے وہ مطعون زباں ہے

ترجیح دی یعنی شاہی منصب کی جگہ فقر پر اکتفا کیا۔ اور یہ شاید اسی نگاہ کی تیغ بازی کا اثر تھا کہ مرزا مظہر کو اپنے دور کے موسیقی کے باکمالوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ محمد شاہی دوریوں تو طاؤس و رباب کا دور ہے لیکن اس کے پاس اتنی دولت نہ تھی کہ وہ اکبر اور جہانگیر کی طرح اعلیٰ فن کاروں کو اپنے دربار میں جمع کر سکے۔ ماہرین موسیقی ایک ایک کر کے سب رخصت ہو چکے تھے اور یہ فن محض پیشہ وروں تک محدود ہو گیا تھا۔ البتہ صوفیوں میں دو باکمال خواجہ میر درد اور مظہر جانجاناں باقی رہ گئے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ "مرزا مظہر جانجاناں اور خواجہ میر درد فن موسیقی کے ایسے ماہر تھے کہ وقت کے بڑے بڑے کلاونت اپنی چیزیں بغرض اصلاح پیش کرتے اور ان کے سر کی ایک ہلکی سی جنبش کو اپنے کمال فن کی سند تصور کرتے"۔

آب حیات میں مرزا کا جو کیریکٹر پیش کیا گیا ہے اس میں عجیب تضاد پایا جاتا ہے کہاں تو یہ نازک مزاجی بلکہ کہنا چاہئے بد دماغی کہ ایک نواب زادہ کے صراحی پر آبخورہ ٹیڑھا رکھنے پر بگڑ بیٹھے اور کہا تجھے کس احمق نے نواب بنا دیا اور کہاں یہ رندی و شاہد بازی کہ وعظ و ارشاد یا شعر و شاعری کا سلسلہ جاری ہے، معتقدین باادب بیٹھے ہیں اور عبدالحی تاباں سے سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔ مانا کہ فقرا بالطبع آزاد ہوتے ہیں اور ادب و آداب کو زیادہ ملحوظ نہیں رکھتے لیکن آزاد صاحب فرماتے ہیں کہ ان کے اوضاع و اطوار اور ادب آداب نہایت سنجیدہ اور برجستہ تھے کہ جو شخص ان کی صحبت میں بیٹھتا ہوشیار ہو کر بیٹھتا تھا"۔ اگر مرزا صاحب تاباں سے واقعی یہ سرگوشیاں روا رکھتے تو کسی بھی شخص کو ان کے سامنے محتاط یا مودب ہو کر بیٹھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی اور نہ ۔۔۔ کے نواب صاحب کو اتنی معمولی سی بات پر جھڑکنے کی جرأت ہوتی۔ ہاں وہ نازک مزاج ضرور تھے جیسا کہ انھوں نے اپنے خود نوشتہ حالات میں اعتراف کیا ہے:

"چوں نقش قدم بر در ایشاں نشستہ است از بس دماغش ضعف قوی دارد"

اپنی شاعری میں بھی جا بجا انھوں نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

در جنوں ہم میرزائی از دماغ ما نہ رفت — گریبانے خویش چاکے ز گلخن داشتیم

بجائے سنگ طفلاں پارہ ہائے شیشہ باید زد — چو مظہر میرزا دیوانۂ نازک طبیعت را

مظہر ز ما برید و دگر یاد ما نہ کرد، — دیوانہ خوش نہ بود ز وضع کرخت ما

لیکن اس نازک مزاجی نے ان میں وہ گرمی پیدا نہیں کی جس کے لئے غالب نے کہا ہے:۔

کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

بلکہ جو شخص ایک بار ان سے مل لیتا تھا، اسے دوبارہ ملنے کی جستجو رہتی تھی۔ ان کی خوش بیانی اور لطافت طبع کی انکے معاصرین نے اکثر تعریف کی ہے۔ مولانا نعیم اللہ لکھتے ہیں: "احوال اجتماع اوضاع آں مشکل پسند باوجود میرزائیت و نازک مزاجی کہ باطوار درویشی موافقت ندارد، بمیزان تقدیر نمی سنجد"۔ میر تقی میر فرماتے ہیں: "بندہ بخدمت او رفتہ سعادت اندوز گشتہ است ۔۔۔ خوش تفہیم بر مرتبہ است کہ در تحریر نمی گنجد"۔

۱۱۹۵ھ / ۱۷۸۰ء کا واقعہ ہے۔ محرم کی ساتویں تاریخ تھی۔ ایک شخص نے دروازہ پر دستک دی۔ آپ دروازہ کھول کر باہر نکل آئے۔ جیسے ہی باہر نکلے اس نے قرابین ماری اور بھاگ گیا۔ گولی دل کے قریب پڑی، تین دن تک اور جئے اور ۱۰ محرم کو جان آفریں کے سپرد کی۔ مجروح ہونے کی حالت میں شدت درد سے لوٹتے تھے اور اپنے ہی اشعار پڑھتے تھے۔

چہ خوش بردئے دل تنگ مادرے واکرد — خدا دراز کند عمر زخم کاری ما،

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن — خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

سیل خوں از سینۂ گرمم رواں کردست عشق — نازم اعجازش کہ طوفاں از تنور آوردہ است

زخم دل مظہر مبادا بہ شود آگاہ باش — کایں جراحت یادگار ناوک مژگانِ اوست

قاتل کون تھا اور ان کے قتل میں کس کس کا ہاتھ تھا۔ اس کا آج تک صحیح پتہ نہیں۔ مختلف تذکروں میں مختلف نام ملتے ہیں۔ شاہ عالم کی طرف سے قاتل کا سراغ لگانے کی کافی کوشش کی گئی جب کچھ پتہ نہ چلا تو مرزا کا اس کا حلیہ دریافت کیا گیا لیکن انھوں نے جواب دیا "میں خود مردۂ متحرک تھا اور مردہ کا مارنا قتل نہیں۔ قاتل ملے تو آپ اسے سزا نہ دیں"۔

مصحفی نے تاریخ وفات کہی:

پس از ساعتے سر ز جیب تامل، — برآوردہ گفت آہ مظہر کجائی ۱۱۹۵ھ

سودا وغیرہ نے بھی تاریخ کہی ہے۔ لیکن سب سے مشہور تاریخ قمرالدین منت کی ہے۔ جس کا مادہ خاص حدیث کے الفاظ ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ موزوں بھی ہیں ——— عاش حمیداً مات شہیداً

دلی میں چتلی قبر کے قریب مرزا کو دفن کیا گیا۔ لوح مزار پر ان ہی کا شعر کندہ ہے جو حسب حال ہے:

بلوحِ تربت من یافتند از غیب تحریرے — کہ ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے

جیسا کہ ابتدا میں ذکر ہوا مرزا نے شاعری خود اختیار نہ کی تھی بلکہ خود شاعری نے انھیں منتخب کر لیا تھا۔ مرزا ان لوگوں میں سے ہیں جن کے متعلق غالب نے کہا ہے:

مانہ بودیم بدیں مرتبہ راضی غالب — شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما

مرزا نے اپنے حالات میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

"بہ تحریک شعر زعشقے کہ نمک خمیر اوست گاہ بے بفریاد و امی کند و چوں نالہ اش موزوں واقع می شود احباب او راہ جوہر شناسی بہ میزانِ اشعارش می سنجند و گرد اورا از غایت انصاف نظر بے سرمایگی خود دکانے پر سخن نچیدہ۔ زیادہ بریں چیست کہ گلہ بدرگاں یافتہ حسن قبولے بہم رسانیدہ است"۔

ان کے ایک شعر سے بھی اس کا پتہ چلتا ہے:

مرا چہ جرم کہ بر نالہ ام زموزونی — غلط کنند عزیزاں بصرفۂ استاد

مرزا کے اس بیان کی تصدیق دوسرے تذکروں سے بھی ہوتی ہے۔ میر تقی میر لکھتے ہیں :۔

" دیوانِ مختصر شعر فارسی او بہ نظر فقیر مولف آمدہ است۔ از سلیم و کلیم پائے کمی ندارد اگرچہ شعر گفتن دون مرتبۂ اوست لیکن گاہے متوجۂ این فن بے حاصل نیز می شود "

قیام الدین قائم مخزن نکات میں لکھتے ہیں :۔

" در اوائل جوانی کہ مقتضائے آں ظاہر است بہ شعر و شاعری مشغول بود آخر حال محو دا از آں اندیشہ باز داشتہ بر سجادۂ طاعت بہ فقر و قناعت می گزارند "۔

فتح علی گردیزی رقمطراز ہیں :۔

" سرشس از بلند ہمتی بہ شعر و شاعری فرو نمی آید و ایں مشغلہ ہا را سرمایۂ افتخار نمی انگارد چنانچہ اکثرے از اشعارش از راہ بے پروائی از صفحۂ خاطر محو شدند و برخے از عدم اعتناد توجہ بایں فن مہجور ابتر گشتند۔۔۔۔۔ شعر فارسی اش بغایت لطافت و نظم ریختہ اش نہایت عذوبت "

مرزا نے شعر و شاعری کو سرمایۂ افتخار نہیں سمجھا اور نہ کبھی اس پر کما حقہ توجہ دی لیکن اسے بزرگوں کی نظر کے فیض کے سوا اور کیا کہا جائے کہ اساتذۂ فن میں ان کا بھی شمار ہوتا ہے۔ میر اور گردیزی کی آرا، کا مذکورۂ بالا سطور میں ذکر ہوا، اب قدرت اللہ شوق، مصحفی اور محمد حسین آزاد کی بھی رائے ملاحظہ فرمائیے۔

قدرت اللہ شوق لکھتے ہیں :۔

" اول کسیکہ طرز ایہام گویاں ترک نمودہ و ریختہ را در زبانِ اُردوئے معلیٰ شاہ جہاں آباد کہ الحال پسند خاطر عوام و خواص وقت گردیدہ و مروج ساختہ زبدۃ العارفین، قدوۃ الواصلین، واقف رموز جناب اکبر کاشف کنوز طریقہ پیغمبر مرزا جانجاناں متخلص بمظہر مرد یست فرشتہ صفت "۔

مصحفی کہتے ہیں :۔

" در ابتدائے شوق شعر کہ ہنوز از میر و میرزا وغیرہ کسے در عرصہ نیامدہ بود۔ در دور ایہام گویاں اول کسے کہ شعر ریختہ بہ تتبع فارسی گفتہ اوست ۔۔۔۔۔ در تمام دیوانش فصاحت و بلاغت زبان استاد جلوہ ظہوری دہد۔ فی الحقیقت نقاش اول زبان ریختہ بایں دو تیرہ باعتقاد فقیر مرزا است "۔

محمد حسین آزاد بھی مرزا کی تراش خراش اور ان کی آرائش بیان کے مداح ہیں :۔

اسی لطافت مزاج اور نزاکت طبع کا نتیجہ ہے کہ زبان کی طرف توجہ کی اور اسے ایسا تراشا کہ جو شعرا پہلے گزرے تھے، انھیں پیچھے چھوڑ کر اپنے عہد کا طبقہ الگ کر دیا اور اہلِ زبان کو نیا نمونہ تراش کر دیا جس سے پرانا راستہ ایہام گوئی کا زمین شعر سے مٹ گیا۔ ان کے کلام میں مضامین عاشقانہ عجب تڑپ دکھاتے ہیں اور یہ مقام تعجب نہیں کیونکہ وہ قدرتی عاشق مزاج تھے اوروں کے کلام میں یہ مضامین خیال ہیں۔ ان کے اصل حال۔ زبان ان کی نہایت صاف و شستہ و شفاف ہے "۔

کہا جاتا ہے کہ مرزا کا فارسی دیوان تیس ہزار اشعار پر مشتمل تھا جس میں سے انھوں نے ۱۱۷۰ھ میں ایک ہزار شعر منتخب کئے تھے۔

اس کے علاوہ انھوں نے "خریطۂ جواہر" کے نام سے پرانے اساتذۂ فارسی کے اشعار کا انتخاب بھی کیا تھا یہ بھی ان کے دیوان کے ساتھ چھپا تھا۔ لیکن افسوس کہ آج یہ دونوں چیزیں نہیں ملتیں ورنہ ان سے مرزا کا مذاقِ نقد کا کسی نہ کسی حد تک ضرور پتہ چلتا۔ انکے اُردو کے اشعار مختلف تذکروں میں ملتے ہیں۔ انھیں مولانا عبدالحیؒ نے بڑی کوشش سے گلِ رعنا میں فراہم کیا ہے لیکن ان سے بھی بہت سے اشعار چھوٹ گئے ہیں۔

ان اشعار کو پڑھکر مرزا کی شاعری کو دو دوروں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ اولاً ایسے اشعار ہیں جن میں شاہ مبارک آبروؔ، شیخ شرف الدین مضمونؔ اور محمد شاکر ناجیؔ کے اشعار کی طرح متروک الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔ لیکن یہ اشعار بھی آبرو یا ناجی کے ابتذال سے پاک ہیں۔ دوسری قسم کے اشعار وہ ہیں جو زبان کی لطافت اور پاکیزگی کی بنا پر میر و سودا کی زبان کی یاد تازہ کرتے ہیں —— ہم ذیل میں دونوں قسم کے اشعار کا انتخاب پیش کرتے ہیں:

جنوں سوں اس قدر روئیں کہ رسوا ہو گئیں آخر
ڈبویا ہائے ان آنکھوں نے آخر خانماں اپنا

قفس کے بیچ کیا حسرت ستی بلبل یہ کہتی تھی
کہ پھر بھی دیکھنا قسمت ہوگا بوستاں اپنا

اری شیریں خدا سوں ڈر جبر لے اپنے عاشق کی
کیا فرہاد نے شیشے سے سر لوہو لہاں اپنا

رات کو یوں گھر بسا مجھ بر میں وہ گل پیرہن
ماہ جس کے باغ میں یک چاندنی کا پھول ہے

کسی کے خون کا پیاسا کسی کے جان کا دشمن
نہایت منہ لگایا ہے سجن نے بیڑۂ پاں کو

مرتا ہوں میرزائی گل دیکھ ہر سحر
سورج کے ہاتھ چونری و پنکھا صبا کے ہاتھ

برگِ حنا اوپر لکھو احوالِ دل مرا
شاید کبھی تو جا کے لگے دلربا کے ہاتھ

مظہر چھپا کے رکھ دل ناوک کے تئیں مرے
یہ شیشہ بچنا ہے کسی میرزا کے ہاتھ

اب دوسری قسم کے اشعار ملاحظہ فرمائیے:

چلی اب گل کے ہاتھوں سے لٹا کر کارواں اپنا
نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا

یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا

مرا جی جلتا ہے اس بلبلِ بیکس کی غربت پر
کہ جس نے آشیانے پر گل کے چھوڑا آشیاں اپنا

جو تو نے کی سو دشمن بھی نہیں دشمن سے کرتا ہے
غلط تھا جانتے تھے تجھ کو ہم جو مہرباں اپنا

کیا آزردہ کرتا ہے سجن اپنے کو لے ظالم
کہ دولت خواہ اپنا مظہر اپنا، جانجاں اپنا

گرچہ الطاف کے قابل یہ دلِ زار نہ تھا
لیکن اس جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا

نہیں کچھ غم کہ کیوں ملتا نہیں پیہاں گسل میرا
کہ میں روتا ہوں دل کی بیکسی پر ہائے دل میرا

اتنی فرصت دے کہ ہولیں رخصت اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آزاد ہم

مت اختلاط کر اے نوبہار تو ہم سے — چمن میں ہونے کا اس خاک کو دماغ نہیں،

اگر یہ سرد مہری تجھ کو آسایش نہ سکھلاتی — تو کیونکر آفتاب حُسن کی گرمی میں نیند آتی

حنا ترے کف پا گر نہ اس شوخی سے سہلاتی — یہ آنکھیں کیوں لہو روتیں انھوں کی نیند کیوں جاتی

الٰہی درد و غم کی سرزمیں کا حال کیا ہوتا — محبت گر ہماری چشم تر سے مینھ نہ برساتی

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو — یہی ایک شہر میں قاتل رہا ہے،

یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے — کہاں اس کو دماغ و دل رہا ہے

خدا کو اب تجھے سونپا نہ رے دل — یہیں تک تھی ہماری زندگانی

کبھی اس دل کو تو آزادی دے جانی — یہ بلبل تھا قفس کا آشیانی،

اگر ملئے تو خفت ہے وگر دوری قیامت ہے — غرض نازک دماغوں کو محبت سخت آفت ہے

خیال ہوتا ہے کہ مرزا کے صوفی ہونے کی وجہ سے ان کے ہاں متصوفانہ اشعار کی بہتات ہوگی۔ اس کا صحیح اندازہ تو انکے فارسی دیوان سے ہی ہو سکتا ہے، اُردو میں ان کے اشعار ہی کتنے ہیں جو ان کے اس رجحان کی تلاش کی جائے۔ ان کے اُردو کے معدودے چند اشعار میں بھی دو چار اشعار ایسے مل جاتے ہیں جو اس رنگ کی غمازی کرتے ہیں:

خداوندا اُٹھا لے ہجر کے درمیان سول پردے — ہمیں صیاد کے اب دام میں ڈالا ہمیں پردے

آزاد ہو رہا ہوں دو عالم کی قید سے، — مینا لگا ہے جب سے کہ مجھ بے نوا کے ہاتھ

گزر گئے دین اور دُنیا سے تس پر، — ترا گھر اور کئی منزل رہا ہے

تجلی گر تری پست و بلند ان کو نہ دکھلاتی، — فلک یوں چرخ کیوں کھاتا زمیں کیوں فرش ہو جاتی

توفیق دے کہ شور سے اک دم تو چپ رہے — آخر یہ میرا دل ہے الٰہی جرس نہیں

محمد عظیم

بھوپال اشتہار دینا حرام ہے جس اس سے زیادہ میرے پاس کوئی ثبوت صداقت نہیں ہے، انشاء اللہ آپ کا فیصلہ ہے

معجون عنبری یہ دوا دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے ولایت کے معزز خاندان، بچوں، جوان، بوڑھے سب کھاتے ہیں۔ اس دوا کے مقابلہ میں سیکڑوں قیمتی ادویات اور کشتہ جات بیکار ہیں، اس سے بھوک کھل بڑھتی ہے کہ دودھ سیر دودھ اور پاؤ بھر گھی ہضم کر سکتے ہیں، اس سے تمام مقوی دماغ ہے کہ کمزوری کی باتیں بھی خود بخود یاد آنے لگتی ہیں، اس کے مثل آب حیات کے تصور فرمایئے اس کے استعمال کرنے سے پہلے اپنا وزن کر لیجئے۔ ایک شیشی چھ سات سیر دودھ آب کے جسم میں اضافہ کر دے گی۔ اس کے استعمال سے ماتھے کا عرق گلاب کرنے سے مطلق تھکن نہ ہوگی، یہ دوا خشک دودھ کو مثل گلاب کے پھول کے سرخ اور شگفتہ کر دیتی ہے ہزاروں ڈاکٹروں حکیموں کے دستخط اس کے استعمال بتا دے گی۔ یہ دوا نہیں ہے ہزاروں بیوں العلاج اس کے استعمال سے امراض دیرینہ کو مثل پندرہ سولہ سال کے جوان ہو گئے ہیں۔ نہایت دھیمی مقوی باہ ہے کہ آپ صحیح نہیں کر سکتے، القصہ اس کی صفت تحریر میں نہیں آ سکتی۔ تجربہ کر کے دیکھ لیجئے اس سے بہتر مقوی دوا دنیا میں نہیں ہے۔

قیمت فی شیشی چار روپیہ (للعہ)

(نوٹ) فائدہ نہ ہونے کی صورت میں قیمت واپس۔ فہرست دوائی مفت منگا لیجئے۔ (نوٹ) ہر شخص کو حاضر و ناظر جان کر لکھتا ہوں کہ یہ دوا اکسیر کا کام کرتی ہے۔ نقاہت سے ہوشیار رہئے، میری ۲۰ سالہ شہرت پر اعتماد فرمائیے

پتہ:- **حکیم ثابت علی شیخ "زبان" خوش کلام**

(عالم مثنوی مولانا سے روم صاحب)

محمود نگر پوسٹ لکھنؤ۔ یو۔ پی

دُنیا کا دائمی امن وسکون

تیسری عالمگیر جنگ کے بعد

(فیچر)

تین شکستہ حال شخص، تار تار لباس میں ایک تباہ شدہ شہر کی
اس سڑک پر بیٹھے ہیں جو کسی وقت بڑی پُر رونق تھی

پہلا : "مصیبت یہ تھی کہ لڑائی ہم لوگوں کے گھر کے اندر تک پہونچ گئی تھی۔ برنزل والے غسل خانہ میں لڑ رہے تھے اور اہل سوئیڈن ہمارے کمرہ کے دروازے توڑ کر اندر داخل ہو رہے تھے"

دوسرا : (غصّہ کے لہجہ میں) "چھوڑو اس قصّہ کو، تمھارے ان لڑائی جھگڑوں کے افسانوں سے تو ناک میں دم ہوگیا"

دوسرا : "جی ہاں، یہ تو ایسی بڑھ بڑھ کر باتیں بناتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے صرف یہی ایک بچے ہیں، جناب ادھر دیکھئے کیا ہم دونوں نے کوئی مصیبت نہیں جھیلی"

تیسرا : "نہیں، میرا مطلب تو صرف یہ کہنا ہے کہ ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ دُنیا کی ۲۰ ارب آبادی میں سے صرف ہمیں تین آدمیوں کو اس نے بچایا اور باقی سب ہلاک ہو گئے"

دوسرا : "خیر وہ تو جو کچھ ہونا تھا ہوا، اب ہم کو دیکھنا چاہئے کہ دنیا میں امن وسکون کیونکر قایم ہوسکتا ہے اس کے کوئی معنی نہیں کہ اس میں پھر شعلۂ جنگ بھڑک اُٹھے"

تیسرا : "آپ نے بالکل صحیح کہا"

پہلا : "آپ نے شعلۂ جنگ کا ذکر کیا تو مجھے یاد آگیا کہ میرے پاس دیا سلائی کا ایک بکس رہگیا ہے جس میں صرف آٹھ تیلیاں ہیں"

دوسرا : "لیکن تمنے ادھر اُدھر اچھی طرح ڈھونڈھ بھی لیا تھا یا نہیں، ممکن ہے کوئی اور بکس مل جائے"

پہلا : "میں نے دُنیا کے ایک ایک کارخانہ کو جاکر دیکھ لیا ہے۔ سگریٹ کا ذخیرہ تو اتنا ہے کہ شاید دو کرور سال تک ضرورت نہ پڑے لیکن دیا سلائی کا کوئی کارخانہ نہیں بچا، سب کے سب جلکر خاک سیاہ ہوگئے"

تیسرا : "کیا میڈرڈ اب تک جل رہا ہے"

دوسرا: " اور انقرہ ؟"

پہلا: " ہاں یہ دونوں اب بھی جل رہے ہیں"

دوسرا: " تو پھر دیا سلائی کی جگہ ہم انھیں کے شعلوں سے کیوں نہ کام لیں"

تیسرا: " لیکن وہ ہمیشہ تو جلتے رہیں گے نہیں ۔ نیویارک ایسا شہر دو سال سے زیادہ نہ جل سکا اور آخر ٹھنڈا ہوگیا۔ اس لئے دیا سلائی کا مسئلہ بہت اہم ہے"

دوسرا: " میری رائے میں پہلے زمین اور پھر ملکوں کی تقسیم کا مسئلہ طے ہونا چاہئے"

پہلا: " بالکل ٹھیک ۔۔۔ (تیسرے سے مخاطب ہوکر) میں تمھیں اس کانفرنس کا چیرمین نامزد کرتا ہوں"

تیسرا: " میں اس خدمت کو قبول کرتا ہوں اور جو اعتماد تم نے مجھ پر ظاہر کیا ہے اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرنے کی پوری کوشش کروں گا ۔ اچھا اب بحث شروع ہوجانا چاہئے"

پہلا: (کھڑے ہوکر) "حاضرین، تیسری جنگ نے ساری دُنیا کو تباہ کر دیا اور خوش قسمتی سے ہمیں صرف تین آدمی تمام روئے زمین پر بچ رہے ہیں ۔ اس لئے دُنیا کے آیندہ امن وسکون کی تمامتر ذمہ داری ہمیں پر عاید ہوتی ہے"

(یہ کہکر بیٹھ جاتا ہے اور باقی دونوں تالیاں بجاتے ہیں)

تیسرا: " اچھا اب اپنے اپنے مطالبات پیش کیجئے ۔ (پہلے آدمی سے مخاطب ہوکر) آپ کون کون سے براعظم چاہتے ہیں"

پہلا: "کرۂ زمین کا جنوبی حصہ ۔یعنی افریقہ، آسٹریلیا اور جنوبی امریکہ مجھ کو دیا جائے"

تیسرا: (دوسرے آدمی سے) "اور آپ کیا چاہتے ہیں"

دوسرا: " میں یوروپ و ایشیا چاہتا ہوں"

تیسرا: (ذرا بگڑکر) تو اس کے معنے یہ ہیں کہ میرے لئے صرف شمالی امریکہ رہ گیا"

پہلا: " خفا نہ ہوجئے، شمالی امریکہ دُنیا کا سب سے زیادہ دولت مند ملک تھا ۔ اور اس میں سترہ کروڑ سے زیادہ انسان بستے تھے ۔ تو کیا تنہا آپ کے لئے یہ کافی نہیں ہے"

دوسرا: " نہیں نہیں، آپ گرین لینڈ بھی لے لیجئے"

تیسرا: " اگر یہ بات ہے تو آپ ہی کیوں نہیں لے لیتے"

دوسرا: " دیکھئے برہمی کی کوئی بات نہیں ۔ امریکہ بہت بڑا ملک ہے اور دو سمندر اس کی حفاظت کے لئے موجود ہیں۔ میں یوروپ چاہتا ہوں اور صرف اس لئے کہ ایشیا سے اس کے ڈانڈے ملتے ہیں"

تیسرا: (پہلے آدمی سے) " تم شمالی امریکہ کے ساتھ مجھے جنوبی امریکہ کیوں نہیں دیتے"

پہلا: " بیوقوفی کی باتیں نہ کرو ۔ یہ تو دیکھو کہ میں نے کتنی قربانیاں کی ہیں"

تیسرا : "اور میں نے تو گویا کچھ کیا ہی نہیں"۔

دوسرا : "میں ایک ترمیم پیش کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ زمین کی تقسیم پر ہم لوگ ابھی متفق نہیں ہیں اس لئے اس مسئلہ میں اور زیادہ چھان بین ہونا چاہئے"

پہلا : "میں اس ترمیم کی تائید کرتا ہوں"

تیسرا : "اچھا تو اب میں سب سے پہلے سوال پر آتا ہوں جو دیا سلائی کی تقسیم سے تعلق رکھتا ہے"

دوسرا : "دیا سلائی کو نوع انسانی کی مشترک ملکیت قرار دینا چاہئے اس لئے میں تجویز پیش کرتا ہوں کہ جو تیلیاں بچ رہی ہیں وہ تینوں میں برابر برابر تقسیم کر دی جائیں"

پہلا : "میں اس تجویز کے ماننے کے لئے آمادہ نہیں۔ کیونکہ اول تو دیا سلائی کو نوع انسانی کی مشترک ملکیت قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں اور دوسرے یہ کہ آٹھ تیلیاں تین برابر حصوں میں بانٹی بھی نہیں جا سکتیں"

دوسرا : "تو پھر کیا ہونا چاہئے"

پہلا : "یہ کہ میں آپ میں سے ہر ایک کو دو دو تیلیاں دوں اور باقی چار معہ دیا سلائی کے بکس کے اپنے پاس رکھوں"

تیسرا : "میں صدر کی حیثیت سے اس تجویز کو نامنظور کرتا ہوں"

دوسرا : "ذرا ضبط سے کام لیجئے"

پہلا : "کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم اپنا قیمتی وقت اس فضول بحث میں ضایع کر رہے ہیں اور دنیا کی از سر نو تعمیر کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے۔ میری رائے میں اس بحث کو ترک کر کے تھوڑی دیر آرام کیجئے۔ اسکے بعد دیکھا جائے گا"

(یہ کہکر وہ چلا جاتا ہے۔ دوسرا آدمی، تیسرے سے آہستہ آہستہ گفتگو کرتا ہے)

تیسرا : "بالکل ٹھیک ہے، یہی ہونا چاہئے"۔ (وہ ہاتھ میں ڈنڈا لیکر کھڑا ہو جاتا ہے)

"چلو چلیں" (دونوں پہلے آدمی کے پیچھے پیچھے جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد مار پیٹ کی آواز آتی ہے اور یہ دونوں واپس آ جاتے ہیں)

تیسرا : "میں سمجھتا ہوں کہ نوع انسانی کو ہمارا شکر گزار ہونا چاہئے کہ ہم نے اس کے دشمن کو فنا کر دیا، اچھا تو لاؤ چار تیلیاں مجھے دیدو"

دوسرا : "چار ؟، چار کیسی ؟"

تیسرا : "یعنی آدھی آدھی"

دوسرا : "افسوس ہے کہ تم انصاف سے واقف نہیں، یہ تو سوچو کہ یہ ترکیب کس نے سوچی تھی"

تیسرا : "لیکن سب سے پہلا ڈنڈا کس نے مارا۔ تم نے یا تم نے ؟"

دوسرا : "اس سے کیا ہوتا ہے، تاہم تم تین تیلیاں لے سکتے ہو"

(تیسرا غضبناک ہو کر ڈنڈا اٹھاتا ہے اور دوسرا ریوالور نکال کر اس پر فیر کر دیتا ہے وہ زمین پر گر جاتا ہے اور دوسرا آدمی دیا سلائی روشن کر کے سگریٹ سلگاتا ہے)

تیسرا : (مرتے ہوئے) "تم نے مجھے مار کے کیا پایا"

دوسرا : "نوع انسانی کے لئے دائمی امن و سکون !" U. N. World

دُرگا بائی صنم

کے تعلقات بے خبر، غالب اور قہر کے ساتھ

درگا بائی صنم، آگرہ کی مشہور و معروف رقاصہ اور اسد اللہ خاں غالب، خواجہ غلام غوث بے خبر اور مرزا حاتم علی قہر کی جلیس و ہم عصر تھی۔ مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی اکبر آبادی کا بیان ہے کہ ان تینوں حضرات سے ان کے خصوصی اور بے تکلفانہ مراسم تھے۔ انھوں نے مندرجۂ ذیل الفاظ میں اُس کی تصویر کھینچی ہے:

"اتنے میں آگرہ کی مشہور رقاصہ درگا بائی متخلص بہ صنم آگئی۔ نوعمر، خوبصورت پیشانی پر قشقہ لگا ہوا، اس سج دھج سے آئی اور آداب و کورنش اس انداز سے بجا لائی کہ جس کو دیکھو وہ بت بنا ہوا تھا..... مرزا غالب بے اختیار کہہ اُٹھے:۔ یہ چوٹی زرافشاں مانگ، سبز اس پر دوشالا ہے ؛ تماشا ہے پر طاؤس میں کالے کو پالا ہے"[1]

یہ ایک خاص ادبی صحبت کا ذکر ہے جو بارۂ شعر و سخن یعنی اکبر آباد میں ۱۸۶۲ء[2] میں منعقد ہوئی، اس صحبت کا انعقاد مفتی افہام اللہ صاحب ساحر کی تحریک پر دیوان سنگھ راجہ کے مکان پر ہوا تھا۔ اور اس میں آگرہ کے مشہور شعرا، شیخ احمد علی شیون، زین العابدین خاں شورش اور خواجہ غلام غوث بے خبر وغیرہ شریک ہوئے تھے۔ غالب آگرہ میں تشریف فرما تھے، انھیں کے اعزاز میں یہ بے طرح مشاعرہ کیا گیا تھا۔ اس صحبت شعر و سخن کا آغاز[3] درگا بائی صنم نے کیا اور یہ غزل پڑھی:

کچھ دوائے دل و جگر نہ ہوئی، مر گئے ہم انھیں خبر نہ ہوئی
اپنی صورت مٹا ہی دی ہم نے ان کی اس پر بھی کچھ نظر نہ ہوئی
دل پہ تاثیر کر گئی ان کے، شکر ہے آہ بے اثر نہ ہوئی
دل و جاں ہجر میں گئے ایسے ایک کو ایک کی خبر نہ ہوئی
رہیں اب دیر ہی میں چل کے صنم اپنی کعبہ میں تو بسر نہ ہوئی

---

[1] بزم آخر ص ۱۲-۱۳ ۔ [2] مفتی صاحب کو اس تاریخ پر اصرار ہے لیکن میں اس کی پوری تحقیق نہیں کر سکا۔ غالب کا یہ فقرہ "مشاعرہ کرنا" میں دلی میں بھی نہیں آتا جاتا۔ کہ ہی قلعہ معلی میں پکڑ بلایا جاتا (دلی)" (بزم آخر ص ۱۱) ثابت کرتا ہے کہ یہ واقعہ اگر صحیح ہے تو ۱۸۵۷ء سے پہلے کا ہونا چاہئے۔

[3] بزم آخر ص ۱۳ ۔ ہماری محرومی ہے کہ مفتی صاحب نے کوئی حوالہ نہیں دیا

اسی مشاعرہ میں شیون نے جو غزل پڑھی تھی، اس کا مقطع یہ تھا:

سُن کر مرے اشعار وہ فرماتے ہیں شیون — بندش ہے یہ کچھ اور، یہ ہے طرزِ بیاں اور

مفتی انتظام اللہ صاحب کا بیان ہے کہ مرزا غالب، شیون کی اس تعلی پر چیں بہ جبیں ہوئے اور فی البدیہہ یہ مقطع ارشاد فرمایا:

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے — کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور[1]

خواجہ غلام غوث بے خبر، مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی کے حقیقی پھوپھا تھے، موخر الذکر وثوق کے ساتھ فرماتے ہیں کہ بے خبر، صنم سے ارتباط اور اختلاط رکھتے تھے، اور اسی وجہ سے ان کی پھوپی، اپنے شوہر سے آزردہ خاطر رہتی تھیں۔

اس ادبی صحبت میں بے خبر نے چند اشعار پڑھے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں صنم اور بے خبر میں کچھ شکر رنجی تھی:

کیوں کر خبر کریں گے کسی بے خبر سے ہم — زخمی ہوئے ہیں آپ کے تیرِ نظر سے ہم

دونوں کی رنجشیں ہیں برابر بڑھی ہوئی — ہم سے خفا وہ شوخ ہے اُس فتنہ گر سے ہم

دل توڑ مت کسی کا خدا کا ہے گھر صنم، — لائیں گے اس طرح کا مکاں پھر کدھر سے ہم

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ بے خبر نے آہ دل سوز میں بھی صنم کا ذکر کیا ہے لیکن مجھے یہ مجموعہ دیکھنے کو نہیں مل سکا۔

مفتی صاحب موصوف حکیم تفضل حسین صاحب اکبر آبادی مرحوم کی روایت سے بیان کرتے ہیں کہ غالب کے بھی صنم سے مراسم تھے۔ یہ مسئلہ بھی تحقیق طلب ہے لیکن مرزا کی آزاد روی اور عیش کوشی سے کچھ بعید نہیں کہ اس قسم کے تعلقات ہوں۔ الگا اکبر آباد کا قیام بالخصوص "شعر و شاہد و شمع و مے و قمار" کا زمانہ تھا۔ آگرہ کی خوش حال ننھیال میں مرزا کو پوری پوری آزادی تھی۔ انھوں نے اکثر جگہ اس "بیہودہ کوشی" پر افسوس کیا ہے اور اُس وقت کے ضایع ہونے پر ندامت کے آنسو بہائے ہیں۔ جو "فرومائگان ہم نشین"[2] اور "اوباشان ہم رنگ" کے ساتھ بسر ہوا۔ ایک فارسی مثنوی میں لکھتے ہیں:

چشم پریشاں نظرے داشتے — جلوہ بہ ہر رہگزرے داشتے

لبن کہ بلا بر اثر انداختے، — دیدہ بصد جا سپر انداختے

زاں ہمہ اجزائے زمانیکہ رفت — واں ہمہ خونابہ فشانی کہ رفت

ہر چہ کنوں می رسدم در نظر — شاہد و شعر است و شراب و شکر

چرخ بسا روز بگشت ایں چنیں، — آہ ز عمرے کہ گزشت ایں چنیں،

ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے مرزا کو یہ نصیحت کی تھی کہ:

"ہم کو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانع فسق و فجور نہیں، پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو"[3]

---

[1] بزم آخر ص ۱۵۱۔ اعیار غالب کے لطیفے ص ۱۶ لیکن یہ غزل غالب نے قبر کو ۱۸۵۸ء میں لکھ کر بھیجی تھی اس لئے یہ روایت ضعیف معلوم ہوتی ہے، ملاحظہ ہو خطوط غالب ص ۳۱۲ ——— [2] مہر نیمروز ——— [3] خطوط غالب ص ۲۱۳۔

اس نصیحت پر ان کا عمل بھی رہا ہے لیکن اُن کے خطوں میں جہاں تک ہمیں معلوم ہے مغل جان[1] اور ایک ستم پیشہ ڈومنی[2] کے علاوہ درگا بائی صنم کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔

مرزا حاتم علی مہر بڑے رنگین مزاج اور خوبصورت آدمی تھے۔ غالب نے لکھا ہے:

"بھائی تمھاری طرح داری کا ذکر میں نے مغل جان سے سنا تھا"

اسی خط میں انھوں نے مہر کے گندمی رنگ اور کشیدہ قامت ہونے کا ذکر کیا ہے اور ان کی صاف اور گھٹی ہوئی داڑھی پر خونِ جگر کھایا ہے۔

مہر کے تعلقات مغل جان سے تھے جس کا اشارہ اوپر ہو چکا ہے، ایک دوسری طوائف چنا جان سے بھی انکو خصوصی ربط اور انس تھا۔ اُس کا انتقال، مہر کی حیات میں ہوا اور اِس طرح اُن کو مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہوئی، لیکن مہر اپنے خطوں میں برابر غم و اندوہ کے شکوہ گزار ہیں۔ غالب ان کو تعزیت کے خط میں لکھتے ہیں:

"کیسی اشک افشانی، اور کہاں کی مرثیہ خوانی، آزادی کا شکر بجا لاؤ، غم نہ کھاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی، منا جان سہی، میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی، اقامت جاودانی ہے، اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے، اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی، طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی، وہی زمردیں کاخ، اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ، چشم بد دور، وہی ایک حور، بھائی ہوش میں آؤ، کہیں اور دل لگاؤ"[3]

مرزا حاتم علی مہر نے چنا جان کے انتقال کی گیارہ تاریخیں کہی ہیں اور ہر تاریخ پر ایک قطعہ کہا ہے۔ ہم ان کے مجموعۂ کلام "الماس درخشاں" سے صرف دو تاریخیں نقل کرتے ہیں:

صغرا کی تصدق ہیں، قربان سکینہ کی — گلزار میں زہرا کے ہر گل کی فدائی ہیں
تاریخ وفات ان کی ہاتف نے پڑھی اے مہر — چنا ہیں گل جنت، جنت میں یہ آئی ہیں
۱۲۷۶ھ

شہر ذیقعدہ و تاریخ نہم، — مہ نہاں گشت ز چشم انجم
دفن گردید شب ادینہ — پر غبارہ آہ شدہ آئینہ،
پئے تاریخ وفاتش در گوش — مطلع مہر ہمیں خواند سروش
آمد اینک بجناب زہرا — کہ عفا اللہ تعالےٰ عنہا
۱۲

درگا بائی صنم سے بھی مہر کا بے تکلفانہ ربط تھا۔ ان کے کلام میں جا بجا اس کی شہادتیں موجود ہیں۔ صنم کا ایک شعر ہے:

تری زلف رسا ہے اور میں ہوں، — یہی دام بلا ہے اور میں ہوں،

---

[1] خطوط غالب ص ۳۱۲ [2] ایضاً ص ۳۱۵ - [3] خطوط غالب ص ۳۱۶

قہر نے اِسی زمین میں پوری غزل کہی ہے ملاحظہ ہو:

بتوں کا سامنا ہے اور میں ہوں — خدا کا آسرا ہے اور میں ہوں،
یہاں آکر کریں کیا یاس و امید، — دل بے مدعا ہے اور میں ہوں،
ملا جو خاک میں قدموں سے چھٹ کے — وہ تیرا نقش پا ہے اور میں ہوں
خدا جانے بتو ہوتا ہے کیا حال — یہی گر دل مرا ہے اور میں ہوں
ذرا آنے تو دے روزِ قیامت — صنم تو ہے، خدا ہے اور میں ہوں
ستم ہے ظلم ہے ان کی طرف سے — محبت ہے وفا ہے اور میں ہوں
پسند اے قہر ہے یہ قولِ استاد — صنم کوچہ تیرا ہے اور میں ہوں[1]

اس کے بعد صنم کی اسی غزل کو تضمین کیا ہے:

بکھیڑا پیچ کا ہے اور میں ہوں، — دل اُلجھن میں مرا ہے اور میں ہوں
یہ سودا سر پڑا ہے اور میں ہوں، — تری زلف رسا ہے اور میں ہوں
یہی دامِ بلا ہے اور میں ہوں

مکان آراستہ گھر ہے تو بے کار — ہوا ہے دخمۂ[2] کفار اے یار
میں ہوں مُردے صورت اس میں ناچار — نہ کوئی یار ہے اپنا، نہ غم خوار
خدا کا آسرا ہے اور میں ہوں

سیہ بخت اور کوئی دوسرا ہے — مجھی سے نام کلجگ کا ہوا ہے
اندھیرا گھپ ہے کچھ بھی سوجھتا ہے — شب فرقت میں سودا زلف کا ہے
یہی کالی بلا ہے اور میں ہوں

نزاکت ختم ہے اس دل رُبا پر — نقاہت مجھ ضعیف و مبتلا پر
دئے ہیں ناتوانی نے لگا پر — اڑا یا ضعف نے مجھ کو ہوا پر
بگولا ہے، صبا ہے اور میں ہوں

میں ہی کرتا ہوں پیار اے جان تم کو — مرے اس چاہنے کی داد تو دو
ادھر دیکھو اجی کچھ منہ سے بولو — سوالِ وصل سُنکر چپ ہوئے ہو
تمہاری "نہ" جفا ہے اور میں ہوں

---

[1] الماس درخشاں ص ۱۲۰ مطبوعہ آگرہ ۱۸۹۵ء — [2] قبرستان

غزل تضمین ان کی کر رہا ہوں، زباں سے ہم زبان دل رہا ہوں،
اب اس سے بڑھ کے نعمت کیا میں چاہوں لب جاں بخش جاناں چوستا ہوں،
نصیب آب بقا ہے اور میں ہوں[1]

صنم کے بقیہ اشعار یہ ہیں:

شب فرقت میں ہوں دم بھر کا مہماں قضا کا سامنا ہے اور میں ہوں
رخ و گیسو کا رہتا ہے تصور یہ غم صبح و مسا ہے اور میں ہوں
یہی کہتا ہے اس ابرو کا مائل، دم تیغ جفا ہے اور میں ہوں
وہاں اغیار سے صحبت ہے انکو یہاں آہ و بکا ہے اور میں ہوں
تری رہ میں نہیں ہے حاجت خضر مرا دل رہنما ہے اور میں ہوں
غم ہجراں ہے کافی دل لگی کو، یہی مونس مرا ہے اور میں ہوں
قیامت کا صنم خطرہ نہیں ہے، نبی حامی مرا ہے اور میں ہوں

حاتم علی مہر (شاگرد ناسخ لکھنوی) نے صنم کی اس غزل کو بھی تضمین کیا ہے جو بقول شہابی صاحب کے خاتب والے مشاعرہ میں پڑھی گئی تھی۔ یہ تضمین بھی ملاحظہ ہو: صحبت اک دم بھی عمر بھر نہ ہوئی کبھی آرام سے بسر نہ ہوئی
کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی کچھ دوائے دل و جگر نہ ہوئی
مر گئے ہم انھیں خبر نہ ہوئی
جو مصیبت پڑی سہی ہم نے کچھ شکایت کبھی نہ کی ہم نے
آخر آخر بری بھلی ہم نے اپنی صورت مٹا ہی دی ہم نے
ان کو اس پر بھی کچھ نظر نہ ہوئی
اچھا بندہ پہ لطف فرمایا واہ تا صبح خوب جگوایا،
بے قراری نے مجھ کو تڑپایا صبر آیا[2] نہ یار ہی آیا،
دل کو تسکین رات بھر نہ ہوئی

آگرہ میں فیض نسیم اور جلوۂ گل کی کمی نہیں تھی۔ ہر سال ایک میلہ طوائفاں ہوا کرتا تھا[3]۔ مہر نے اسکے تعین کی تاریخ بھی کہی تھی۔ مفتی صاحب کا خیال ہے کہ یہ قطعہ تاریخ بھی درگا بائی صنم کی فرمائش پر کہا گیا تھا۔ یہ قطعہ الماس درخشاں میں موجود ہے:

مہوشوں نے کیا میلہ ایجاد مہر دل لینے کا ساماں دیکھو
اکبر آباد جو ہے رشک چمن اس میں اک تازہ گلستاں دیکھو
میں بھی اب مصرعِ تاریخ لکھوں نقشۂ بزم پریستاں دیکھو
۱۲۶۲ھ

(راقم۔ احمد فاروقی)

---

[1] الماس درخشاں ص ۱۴۴۔ [2] الماس درخشاں ص ۱۴۱۔ [3] تیراکی کے موسم میں آرام باغ وغیرہ کے میلے، بچ کنوئیں کے قبرستان اور تاج محل میں عید کی تڑکے میلے اب سے پندرہ بیس برس پہلے تک ہوتے تھے اور ان کے دیکھنے والے آج تک آگرہ میں موجود ہیں۔ یہ میلے "رامش و رنگ و بو" کے لئے خاص شہرت رکھتے تھے۔

برطانیہ کا اقتصادی بحران

پچھلے سال کے دوران میں برطانیہ کا اقتصادی بحران اور بھی شدید صورت اختیار کر گیا۔ اس اقتصادی بحران سے برطانیہ کی پوری معیشت پر بڑا بُرا اثر پڑا ہے۔ ایندھن، لوہے اور فولاد کے طیار سامان کی سخت کمی ہے، مالی انتشار پیدا ہو گیا ہے، قیمتیں برابر بڑھتی چلی جا رہی ہیں، ڈالر کی کمی ہے اور محنت کش عوام کا معیار زندگی بد سے بدتر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں اخراجات کی مد میں ۴۵ کروڑ پونڈ کا خسارہ تھا، جو ۱۹۴۷ء میں اور بھی بڑھ گیا اور ۶۰ کروڑ پونڈ تک پہونچ گیا اور ظاہر ہے کہ موجودہ حالت میں یہ خسارہ اور بھی بڑھتا جائے گا۔ امریکہ سے ۳ ارب ۷۵ کروڑ ڈالر قرض لئے گئے تھے، اور انھیں پانچ سال کے اخراجات میں صرف کرنا تھا۔ لیکن ایک سال کی مدت ہی میں یہ رقم تقریباً سب کی سب خرچ ہو گئی۔

برطانیہ کے اقتصادی بحران کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ لیبر گورنمنٹ نے ملک کی معیشت کو امریکہ کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے۔ امریکہ کے بڑے بڑے سرمایہ دار، سامراجی اور جمہوریت دشمن لیڈر اس بات کی طیاری کر رہے ہیں کہ تمام دُنیا پر امریکی سرمایہ کا تسلط قایم ہو جائے۔ دورانِ جنگ میں برطانیہ عظمیٰ بہت کمزور ہو گیا اور اب امریکی اجارہ داروں کی رہنمائی میں سامراجیوں کے کیمپ میں امریکہ کا دوسرے درجہ کا شریک کار ہو گیا ہے۔ ایٹلی اور بیون کی حکومت عوام کے مفاد کے سراسر خلاف اپنے ملک کے چرچل جیسے سامراجیوں اور وال اسٹریٹ کے سرمایہ داروں کو شہ دے رہی ہے۔

برطانیہ کی لیبر حکومت نے امریکہ کے ساتھ ملکر سامراجی منصوبوں کو پورا کرنے کی ٹھانی ہے اور نئی عالمگیر جنگ کی دھمکیاں دینی شروع کر دی ہے اور بیرونی ممالک میں بڑی بڑی فوجیں رکھ کر بے انتہا رقم خرچ کر رہی ہے۔ جنگ کی وجہ سے برطانیہ کا بجٹ کمزور تو ہو ہی گیا تھا اب ان مزید اخراجات کی وجہ سے حالت اور بھی خراب ہو گئی ہے۔

اس وقت برطانیہ کی فوج ۱۹۳۹ء کی تعداد کے مقابلہ میں تین گنی ہے۔ اتنی بڑی فوج کو رکھنا نہ تو خود برطانیہ کے مفاد میں ہے اور نہ جنگ کے بعد قیام امن کے مفاد میں۔ ۱۹۴۷ء کے بجٹ کے مطابق فوجی اخراجات ایک پاؤنڈ میں ۱۲ شلنگ (۶۰ فیصدی) کے برابر تھے اور باقی ۸ شلنگ فی پونڈ ملک کی زمانۂ امن کی ضروریات کے لئے خرچ کیا گیا۔

برطانیہ کے عوام مطالبہ کرتے ہیں کہ فوجوں کو گھٹا کر جنگ سے پہلے کی تعداد پر رکھا جائے۔ لیکن پھر بھی لیبر گورنمنٹ نے ملک سے باہر سمندر پار بہت بڑی تعداد میں فوجوں کو بھیج رکھا ہے اور وہاں وہ امریکی سامراجیوں کے ساتھ ملکر مجرمانہ جنگ جاری کئے

ہوئے ہیں جیسے کہ مثال کے طور پر یونان میں مداخلت کی جنگ کر رہے ہیں - اس طرح سے لیبر گورنمنٹ برطانیہ کی قومی معیشت پر وہ بوجھ ڈال رہی ہے جسے وہ برداشت نہیں کر سکتا - اس رقم کو غلط طریقہ سے استعمال کر کے ملک کی قومی صنعت کی بحالی کے لئے ضروری رقم نہیں صرف کر رہی اس لئے عوام کی ضرورتیں پوری نہیں ہو سکتیں -

امریکہ سے قرضہ یہ بہانا کر کے لیا گیا تھا کہ اس رقم کو ملک کی دوبارہ تعمیر کے لئے استعمال کیا جائے گا، لیکن اس سے عوام کا معیار زندگی بہتر بنانے کے لئے کچھ بھی نہیں کیا گیا بلکہ اس رقم کا بہت بڑا حصہ فوجوں کے اخراجات میں صرف ہوا - اور سب سے زیادہ اہم چیز یہ ہے کہ اس قرضہ کی کڑی شرطیں امریکہ کے سرمایہ داروں نے اپنی مرضی کے مطابق رکھی تھیں - اینگلو امریکی مالیاتی سمجھوتہ کے مطابق امریکی تجارت کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں برتا جا سکتا - ڈالر کو پونڈ میں بدلنے کی سہولت کے مراعات لیکر امریکہ نے یہ قرضہ بہت جلد ختم کرا دیا، انفلیشن بڑھ گیا اور برطانیہ "ڈالر کا بھوکا" ہو گیا - برطانیہ کی کمزوری سے فایدہ اُٹھا کر امریکہ کے سرمایہ داروں نے اسٹرلنگ بلاک کے علاقوں میں بھی اسی طرح اقتدار جمانا شروع کر دیا ہے، جیسے کہ خود اپنے ہی گھر میں ہوں - برطانیہ کی نوآبادیات سے اس کے تعلقات کو توڑنے کی کوشش میں امریکی سرمایہ داروں نے برطانیہ کو مجبور کیا کہ وہ ڈالر سے امریکی سامان خریدے - حالانکہ اکثر حالات میں برطانیہ اسٹرلنگ کی صورت میں قیمت ادا کر کے یہی مال دیگر ممالک سے سستا، اچھا اور جلدی خرید سکتا تھا - پاؤنڈ کے ڈالر میں جلدی سے تبدیل ہونے کی آسانیاں مہیا ہو جانے کا تباہ کن نتیجہ یہ ہوا کہ لندن کے بنکوں سے ڈالر نکلنا شروع ہو گیا - ۱۵ر جولائی ۱۹۴۷ء سے برطانوی حکومت نے پاؤنڈ کی ڈالر میں تبدیلی شروع کی لیکن ملک کی پوری مالی تباہی کو روکنے کے لئے ۲۰ر اگست ۱۹۴۷ء کو ہی اس تبادلہ کو روک دینا پڑا - اس کے نتیجہ کے طور پر امریکہ نے قرضہ کی باقی رقم ۴۰ کروڑ ڈالر کو روک لیا اور اس طرح مجبور ہو کر برطانیہ کو اپنے خزانہ کے سونے کو خرچ کرنا پڑا -

پاؤنڈ کے خلاف ڈالر کا جارحانہ حملہ برابر جاری ہے - امریکی سرمایہ دار برطانیہ کی امداد کو مارشل پلان کے مطابق "امداد" تصور کرتے ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ برطانیہ کو اپنی نوآبادیات میں جو خاص مراعات حاصل ہیں اسے ختم کر دیں اور اس طرح برطانوی نوآبادیات میں گھسنے کی تمام رکاوٹیں دور کر دینے کی کوشش کر رہے ہیں - ان کے علاوہ امریکہ یہ بھی کوشش کر رہا ہے کہ برطانیہ کی قومی معیشت کو بھی اپنے زیر اقتدار لے آئے - امریکہ کے سرمایہ داروں نے برطانیہ کے سامنے جہاز سازی کی صنعت کو کم کر دینے کی تجویز پیش کر ہی دی ہے - امریکہ کے اجارے دار خاص خاص سمندری راستوں پر سمندری تجارت میں کسی قسم کے مقابلہ کو پسند نہیں کرتے - ان میں وہ بحری راستے بھی شامل ہیں جو برطانیہ کو اس کی نوآبادیات سے ملاتے ہیں -

لیکن برطانیہ کے اقتصادی بحران کا گہرا تعلق جنگ کے بعد سرمایہ دارانہ نظام کے عام اقتصادی بحران سے ہے - برطانیہ کی سرمایہ دارانہ قومی معیشت اپنے فرسودہ سرمایہ کو تیزی کے ساتھ تبدیل کرنے اور بڑھانے میں ناکام ثابت ہوئی - اگر یہ ممکن ہو جاتا کہ وہ اپنے سرمایہ کو بڑھا لیتا تو پھر دوسرے ممالک سے مقابلہ کر سکتا تھا اور اپنے اخراجات اور آمدنی کے توازن کو باقاعدہ قایم رکھ سکتا تھا - آمدنی اور اخراجات میں توازن قایم نہ رہنے اور سالانہ بجٹ میں بڑھتے ہوئے خسارے کا نتیجہ یہ ہے کہ

برطانیہ کو اقتصادی بحران کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ خسارہ کی وجہ یہ ہے کہ برطانیہ اپنی درآمد اور برآمد میں توازن قایم نہ رکھ سکا۔

ان تمام کے علاوہ حالات کو بدتر بنانے کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ لیبر گورنمنٹ اب بھی امریکہ کی رہنمائی میں چل رہی ہے اور خارجی پالیسی وہی چرچل کی پرانی جنگجویانہ پالیسی ہے جو یقیناً برطانیہ کے لئے مہلک ہے۔ حالانکہ ہونا یہ چاہئے تھا کہ برطانیہ امن پسند جمہوریتوں سے تعلقات پیدا کرتا جو ڈالر کے پھندے میں نہیں پھنسیں اور جنھوں نے منصوبہ بندی کے ماتحت اپنی قومی معیشت کو بحال کرکے مابعد جنگ کی مشکلات کو حل کیا اور اپنی قومی آزادی اور خودمختاری کو برقرار رکھا۔

لیبر پارٹی کی اندرونی پالیسی بھی اتنی ہی تباہ کن ہے۔ اقتصادی بحران کے چھٹکارا پانے کے لئے لیبر گورنمنٹ نے جو کرپس کی پلان پیش کی ہے وہ حقیقتاً اس بحران کی شدت کو اور بھی زیادہ بڑھا دے گا اور عوام کو وہ مصیبتیں اُٹھانی پڑیں گی، جن کا انھیں دوران جنگ کے بدترین زمانہ میں بھی نہیں کرنا پڑا تھا۔ اس پلان کے اعتبار سے برآمد کے لئے پیداوار کو زیادہ سے زیادہ بڑھانا چاہئے اور عوام کے استعمال میں گھر کی بنی ہوئی اشیاء اور باہر سے منگائی ہوئی اشیاء دونوں کا صرفہ کم کر دینا چاہئے۔ اسکے علاوہ اس پلان میں صنعت میں مزید رقم لگانے پر پابندی عائد کر دی گئی ہے اور ۱۹۴۵ء میں انتخابات کے دوران میں لیبر پارٹی والوں نے مکانات کی تعمیر اور دیگر سماجی اصلاحات کے جو وعدے کئے تھے وہ بھی اس پلان کی رو سے رد کر دئے گئے ہیں۔ اور پھر اسکے علاوہ مزدور طبقے پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ وہ اپنی کارگزاری کو بڑھائیں حالانکہ ان کی حقیقی اجرتوں میں برابر کمی ہوتی چلی جا رہی ہے۔

آج جنگ ختم ہو جانے کے ڈھائی سال کے بعد راشن کی مقدار دوران جنگ کی مقدار سے بھی کم کی جا رہی ہے۔ روٹی اور آلو پر آجکل راشن ہے حالانکہ لڑائی کے دوران میں یہ دونوں اشیاء بغیر راشن کارڈ کے حاصل کی جا سکتی تھیں۔ شکر، گوشت اور چربی کے راشن کی مقدار میں کمی کر دی گئی ہے۔ ۱۹۳۹ء کے مقابلہ میں پاؤنڈ کی قوت خرید ایک تہائی رہ گئی ہے اور یہ قیمت اور بھی گھٹتی چلی جا رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ضروریات زندگی کی چیزوں کی پیداوار میں بڑی کمی ہو گئی ہے، بازار کا اصلی کنٹرول بڑے بڑے سرمایہ داروں کے قبضہ میں ہے۔ اور امریکہ سے منگائے ہوئے اور ڈالر کی صورت میں قیمت ادا کئے ہوئے مال کی قیمتیں برابر بڑھتی جا رہی ہیں۔ "ٹائمز" میں جو اعداد و شمار شایع کئے گئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ امریکہ سے جو اشیاء مثلاً گیہوں، تمباکو وغیرہ منگائے جاتے ہیں ان کی قیمتیں ۱۹۳۹ء کے مقابلہ میں ۳۰۰ اور ۴۰۰ فیصدی تک بڑھ گئی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ پچھلے ایک سال سے ملک میں زبردست (افراط زر کا غدر) انفلیشن ہے اور عوام کی بہت بڑی اکثریت قیمتوں کے بڑھ جانے کی وجہ سے نہایت عسرت کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ کرپس پلان اقتصادی بحران کا تمام بوجھ صرف محنت کش عوام کے کندھوں پر لاد دیتی ہے اور بڑے بڑے سرمایہ داروں پر ذرا بھی اثر انداز نہیں ہوتی اور وہ حقیقی معنوں میں قیمتوں پر کنٹرول نہ ہونے کی وجہ سے بڑے بڑے منافعے کما رہے ہیں۔ اور سٹہ بازی کرکے مزدور طبقہ کا استحصال کر رہے ہیں۔ برطانیہ اپنے اس معاشی بحران سے صرف اسی وقت نجات حاصل کر سکتا ہے جبکہ وہ اپنی موجودہ اندرونی اور بیرونی پالیسی کو تبدیل کرے۔ اسوقت تو برطانیہ کی اندرونی اور بیرونی پالیسیوں سے صرف امریکہ کے مفاد پورے ہوتے ہیں اور جو تجارتی معاہدے ہو رہے ہیں وہ امریکہ کے سرمایہ داروں اور جنگجویانہ پالیسی اختیار کرنے والے امریکی سیاستدانوں کے مفاد میں ہیں۔

"جی۔ کولاکوف"

(ٹاس۔ سوویٹ نیوز ایجنسی)

انشاءؔ قصیدہ گوئی کی حیثیت سے

انشاءؔ سے پہلے مرزا محمد رفیع سوداؔ اُردو قصیدہ کو فارسی قصیدہ کا ہم پلّہ بنا چکے تھے اور جملہ آشنایان سخن نے سوداؔ کو اُردو زبان کا انوری اور "مدح و قدح کا بادشاہ" تسلیم کر لیا تھا۔

انشاءؔ کی قصیدہ گوئی کا مرتبہ اس سے ظاہر ہے کہ اُردو قصیدہ گوئی کی تاریخ میں سوداؔ کے بعد دوسرا نام انشاءؔ کا ملتا ہے۔

انشاءؔ کی کلیات میں دس قصیدے اُردو کے ہیں جن کا موضوع حمد۔ نعت۔ منقبت اور مدح سلاطین و کبار ہے فارسی قصاید کی تعداد بھی خاصی ہے۔ محمد حسین آزادؔ نے اُن کے قصاید پر جو تبصرہ کیا ہے وہ پڑھنے کے قابل ہے۔ لکھتے ہیں: "قصاید بڑی دھوم دھام کے ہیں۔ الفاظ کی شکوہ۔ طبیعت کی بلند پروازی کی کوئی حد نہیں۔ مگر سیدھے چلتے چلتے ایک ایسی چال بدلتے ہیں کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ وہ یہی بات ہے کہ اپنی زباندانی کے جوش اور قوت بیانی کے مزے میں آکر کبھی کوئی شوخ مضمون کبھی کوئی خوش آیند ترکیب اور نئی تراش ایسی سوجھ جاتی ہے کہ اُسے باندھے بغیر نہیں رہ سکتے اور وہاں قصیدے کی متانت اور وقار کے اُصول ہاتھ سے جاتے رہتے ہیں۔ اس میں کبھی تو کلام میں شوخی اور ایک قسم کا بانکپن پیدا ہو جاتا ہے اور کبھی متبذل ہو جاتا ہے۔ مگر پھر لطافت یہ ہے کہ قدرتی لذت جو زبان میں ہے وہ کلام کو بدمزہ نہیں ہونے دیتی اور اسی واسطے جس دربار یا جلسہ میں قصیدہ پڑھتے تھے سبحان اللہ اور واہ وا کہنے کے سوا سننے والوں کو ہوش نہ ہوتا تھا۔ اس بے اعتدالی کا یہ سبب تھا کہ طبیعت میں طاقت بہت تھی مگر اُس پر قابو نہ تھا۔

ان قصیدوں میں مزہ وہاں آتا ہے جہاں ممدوح کی تعریف کرتے کرتے دفعتہً کہتے ہیں کہ دارائے ایران تجھے ایران میں بیٹھا کہہ رہا ہو اور جھٹ چند شعر فارسی کے اس طرح کہہ جاتے ہیں گویا ایک آغائے تازہ ولایت آیا اور اپنی چنیں و چناں کے ساتھ شیرۂ شیراز کے دو دو گھونٹ سب کو پلا گیا۔ اس کے برابر گویا ایک عرب العرباجبّہ پہنے عبا اور عمامہ سجے سامنے کھڑا ہے۔ پھر شاہ بخارا ترکستان سے ترکی میں آواز دیتا ہے اور ساتھ ہی عالی جاہ کابل اپنی افغانی میں کہتا ہے اور برج کی گوپیاں یوں کہتی ہیں اور پنجاب میں جھنگ سیالے کی جٹیاں یوں کہتی ہیں وغیرہ وغیرہ"

آزادؔ کے تبصرہ پر اختلاف رائے کی کہیں گنجایش نظر نہیں آتی ہے۔ درحقیقت انشاءؔ کی طبیعت میں زور حدِ اعتدال سے زیادہ تھا اور اُن کے اسی زور طبع اور دیگر زبانوں میں مہارت تامہ کا نتیجہ تھا کہ وہ اُردو میں اشعار کہتے کہتے عربی۔ فارسی۔ ترکی پشتو اور بھاشا کے بھی اشعار کہہ جاتے تھے۔ قصاید میں بھی اُن کا مخصوص رنگ وہی ہے جو اُن کی غزلیات کا یعنی شوخی و بانکپن۔

انشاء کے قصاید کا لفظی حسن و قبح

علماء معانی و بیان نے قصیدہ کی زبان کا معیار یہ قرار دیا ہے کہ اُس کے الفاظ شاندار متین اور باوقار ہوں لیکن اس سے یہ مقصد نہیں ہے کہ قصیدہ گو جزالتِ الفاظ کے شوق میں حدِ اعتدال سے اتنا آگے بڑھ جائے کہ قصیدہ کو ثقیل اور گراں الفاظ۔ مبہم لغات اور غیر معروف علمی اصطلاحات سے بوجھل کر دے انشاء کے قصاید میں یہ عیب اور صواب دونوں موجود ہیں۔ اُن کے قصاید کے الفاظ اگر ایک طرف متین۔ شاندار اور باوقار ہیں تو دوسری طرف ثقیل اور مبہم بھی لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ خامی محض انشاء ہی کے حصہ میں نہیں آئی ہے۔ اُردو زبان کے چند دیگر مشہور شعراء مثلاً ذوق، مومن اور میر کا کلام بھی اس عیب سے پاک نہیں ہے۔

اسی سلسلہ میں ایک اور خاص چیز جس سے پرہیز کرنے کی علمائے معانی نے تاکید کی ہے وہ یہ ہے کہ قصاید میں ایسے الفاظ کے استعمال سے بھی گریز کرنا چاہئے جو بازاری ہلکے اور عوام الناس کی زبانوں پر جاری ہوں۔ ہمیں ماننا پڑے گا کہ یہ خامی بھی انشاء کے قصاید میں موجود ہے۔

انشاء کے قصاید کے معنوی محاسن و معائب

ناقدین قصیدہ نے معنوی محاسن و معائب کا معیار یہ مقرر کیا ہے کہ جس طرح قصیدہ کے لئے شاندار اور باوقار الفاظ کی ضرورت ہے اسی طرح معانی بھی بلند ہونا چاہئے کیونکہ اگر متین الفاظ میں سوقیانہ اور پست خیالات کا اظہار کیا جائے گا تو وہ اشعار معنوی خوبی سے خالی ہونگے۔ یہ خامی بھی انشاء کے کثیر اشعار میں پائی جاتی ہے لیکن یہاں بھی انشاء اکیلا نہیں ہے۔ یہی عیب "مدح و قدح کے بادشاہ" سودا کے کلام میں بھی موجود ہے۔

فنی در و بست کے اعتبار سے انشاء کے قصاید کا پایہ

قصیدہ کی تقسیم چار چیزوں پر کی گئی ہے تشبیب یا تمہید اسے نسیب بھی کہتے ہیں۔ دوسری چیز گریز یا تخلص تیسری مدح اور چوتھا خاتمہ و دعا۔

ان چاروں چیزوں کے جانچنے کے لئے اساتذۂ تنقید نے معیار مقرر کئے ہیں۔ لیکن ان چار چیزوں کے علاوہ ایک اور چیز بھی ایسی ہے جو قصیدہ کے حسن یا قبح کا سبب بن جاتی ہے اور یہ مطلع ہے، مطلع کے کامیاب ہونے کی پہچان یہ ہے کہ اس میں کوئی ایسی نئی بات بیان کی گئی ہو جو سامعین کو قصیدہ کی طرف متوجہ کرلے اور اُن کو آئندہ اشعار سننے کا مشتاق بنادے۔ انشاء کے اکثر مطالع اس معیار پر پورے اُترتے ہیں۔ ان کے چند قصاید کے مطالع یہ ہیں:

در مدح دُلہن جاں:۔

سحر بہار کی غوشہ میں آگئی لپٹ — کہ صاف چاند سے کھڑکیوں کے کھل گئے کھٹاکھٹ

در مدح سلیمان شکوہ:۔

مجھدم ہیں نے چلی بستر گل پہ کروٹ — جنبش بادِ بہاری سے گئی آنکھ اُچٹ

چناں بمجلس دردی کشاں شدم محق — کہ بادہ بیچکدم از مسام جائے عرق

اردی بہشت زد بخیاباں دگر کمند — آمد زمانِ مستی و دی کشِ نژند

مطلع کے بعد تشبیب آتی ہے۔ یہ دراصل تمہید ہے اس میں مختلف مضامین مثلاً اخلاق و موعظت۔ جفائے گردوں وغیرہ ہوتے ہیں، یا محض اصل قصیدہ کے موضوع کی تمہید ہوتی ہے۔ انشاء کے قصاید کی تمہید میں اصل موضوع کا پس منظر ہی ملتا ہے اور کسی دوسری قسم کے حکیمانہ خیالات نہیں پائے جاتے۔ نواب سعادت علی خاں کی مدح میں ایک قصیدہ ہے اُس کی تشبیب ملاحظہ فرمائیے:-

نظر آئی مجھے کل باظفر و طبل و علم — صورت فتح مجسم وہ بشکل آدم

سر پہ ایک خود دھرے جسپہ بڑی سی کلغی — ڈھال کاندھے پہ پڑی ہاتھ میں شمشیر دودم

زرۂ حضرت داؤد گلے میں اُس کے — جبروت اُس کا فریدوں فر و جمشید شیم

خضر و الیاس جلو اُسکے میں جوں چاؤشاں — بھلہ رے سطوت و فیروزی و اجلال و حشم

لمعۂ نور جبیں اُس کی سے طالع جوں مہر — سب رکاب اُس کی میں موجود صنادید عجم

اُس کے افواج کے گھوڑوں پہ کیا خوب جودھیان — تو وہ بنکارے پڑے پھرتے تھے مثل ضیغم

دیکھ القصہ اُسے چونک گئیں یوں آنکھیں — دفعتہً چونک پڑیں جیسے غزالان حرم

ذوق نے ایک قصیدہ اکبر شاہ ثانی کے فرزند شہزادہ سلیم کی شادی کے موقع پر کہا ہے وہ بھی انشاء کے متذکرۂ بالا قصیدہ کا ہم قافیہ ہے اس لئے اس کی تشبیب بھی دونوں کے موازنہ کے لئے یہاں نقل کی جاتی ہے۔

تشبیب قصیدۂ ذوق

افق دل پہ میرے عیش و طرب دونوں بہم — آج یوں آئے سحر جیسے دو پیکر توام

ایک کا ایک سے وہ ربط سخن تھا گویا — دو لبِ یار ہیں یا حضرت عیسیٰ ہمدم

روشِ ناز پہ ہمدوش تھے یوں جیسے کبھی — لام الف لکھتا تھا اسلام کا یاقوت رقم

یا تھے دو مصرع مربوط بہم دست و بغل — یا کہ پیوند تھے دو نخل گلستانِ ارم

دونوں پیچیدہ بہم ایسے سیہ مستی میں — کوئی مشاطہ بھی یوں گوندھے نہ جعد پُرخم

ایک معنی کے وہ لفظاً مترادف تھے دو — ایک ہی معنی کے دو فقرے مگر مستحکم

تھے جڑے دو در شہوار کہ ہرگز نہ ملیں — ابرِ نیساں سے گریں لاکھ اگر قطرۂ یم

ایسے تھے دونوں وہ یکدل کہ دو قالب یکجاں — یکزباں دونوں وہ اس طرح کہ جوں چاک قلم

آئے لپٹے ہوئے یوں عالم سرشاری میں — نالۂ زیر کے ہمراہ ہو جوں نالۂ بم،

امیر مینائی کے اُس قصیدہ کی تشبیب بھی نقل کرنا یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے جو خلد آشیاں نواب کلب علی خاں والی رامپور کی مدح میں ہے۔

تشبیب قصیدۂ امیر مینائی

تخت کاغذ پہ ہوا صدر نشیں شاہِ قلم — دایرے طبل کی صورت ہیں الف شکل علم
ہیں جو یہ عرصۂ کاغذ پہ حروف و حرکات — یہی لشکر ہیں یہی فوج یہی خیل و خدم
ہے فصاحت جو مصاحب تو بلاغت ہے ندیم — وزرا مرتبۂ و دبدبۂ و جاہ و حشم،
منتخب ہیں جو مضامین تو معانی ہیں لطیف — ہیں وہی گنج و خزائن وہی دینار و درم
اہل دفتر نے جو کی کھولکے بستوں کو نشست — گردنِ منشی گردوں ہوئی تسلیم کو خم
کبھی منصب کبھی تقسیم میں دیں جاگیریں — شقّے لکھے گئے ہونے لگے فرمان رقم
وقتِ دربار ہوا جمع ہوئے مجرائی — عقل و فہم و خرد ہوش و تدابیر و حکم
سامنے آنے لگے خیر طلب بہر سلام — آدمی تھا جو ادب کا وہ پکارا پیہم
روبرو خسرو جم جاہ و ملک فر کے نگاہ — تا ابد سلطنت پشت و پناہ عالم
ہوئی مجرے سے بخوبی جو فراغت حاصل — مسندِ حکم ہوئی مطلع انوارِ قدم
روبرو دستخطِ خاص کو لایا کاغذ — حکمت الدولہ جو تھا منشیٔ یاقوت رقم
عرضیاں گزریں خلائق کی برائے مطلب — لب ہوئے لعل فشاں کھل گئے ابواب کرم
بعد اخبار کے پرچوں کو جو نوبت آئی — نئے مضمون کا اک پرچہ ہوا پیش اُسدم
کہ ملازم جو ہیں سرکار کے دو دانش دو ہم — در دولت پہ ہے ہنگامہ لڑے ہیں باہم
بحث اک بات کی دونوں میں پڑی ہے ایسی — کہ بہم گتھ گئے ہیں صورت خط توام
حکمِ عالی یہ ہوا جلد کرو حاضر بزم — دیکھیں کیا کہتے ہیں خود دونوں میں ہم ہونگے حکم
حاضرِ بزم ہوئے وہ تو ہوا یہ ایما، — کیوں لڑے کیا سبب جنگ ہے آگاہ ہوں ہم

تشبیب کے بعد گریز آتا ہے اور دراصل یہی قصیدہ میں سب سے زیادہ اہم چیز ہے۔ گریز کا کام یہ ہے کہ مختلف الموضوع تشبیب اور مدح کو آپس میں اس طرح پیوند دے کہ دونوں ایک چیز نظر آنے لگیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کام بہت دشوار ہے۔ اسی لئے یہ قصیدہ گو کو جانچنے اور پرکھنے کی بہترین کسوٹی ہے۔

انشاء کے قصائد میں گریز اچھا ہوتا ہے متذکرہ بالا انشاء کے قصیدہ کا گریز ملاحظہ فرمائیے :-

بادب میں نے یہ معروض کیا اسم شریف — بارے فرمائیے اے مخزن الطاف و کرم

تو یہ ارشاد ہوا تجھ کو نہیں کیا معلوم — نیّرِ طالع فیروز ہیں اُس شخص کے ہم
وہ سعادت علی خاں عالی اعلیٰ جو ہے — معدنِ جود و سخا منبع احسان و کرم
آج صد شکر خدا اُس نے کیا جشنِ جلوس — جس کی توصیف کی انشاؔ میں قلم ہے ابکم

ذوق کے متذکرہ قصیدہ کا گریز

میں نے پوچھا جو سبب اُنکے بہم ہونیکا — تو یہ ہاتف نے کہا غیب سے ہو کر ملہم
آج اُس شاہ کے فرزند کی ہو شادی طوی — کہ شجاعت میں وہ رستم ہے سخا میں حاتم
کون وہ ظلِ خدا شاہ محمد اکبر — جس کے ہمت سے ہوں دریوزہ گر ارباب ہمم

امیر کے متذکرہ قصیدہ کا گریز

عرض دانش نے یہ کی روزِ ابد تک قایم — یہ حکومت یہ ایالت یہ شہامت یہ حشم
بندۂ خاص نے دیکھے ہیں ہزاروں انساں — حکمرانانِ زمانہ رو سائے عالم
ایک حاکم ہے فلک جاہ خرد مند زکی — صاحبِ علم و ہنر معدنِ اخلاق و کرم
نام ہے کلبِ علی خاں بہادر جم جاہ — جس کے خدام ہیں ہم مرتبۂ قیصر و جم

گریز کے بعد مدح کا آغاز ہوتا ہے مدح کے سلسلہ میں ہمارے قدیم شعرا نے خوب خوب مبالغہ کیا ہے۔ جس کی مذمت مولانا حالی نے اپنے مشہور "مقدمہ" میں اس طرح کی ہے:۔

"مدح میں زیادہ تر وہی معمولی محامد بیان ہوتے ہیں جو قدیم سے شعرا باندھتے چلے آئے ہیں اور ہر ایک خوبی کے بیان میں ایسا مبالغہ کیا جاتا ہے کہ قصیدہ کا مصداق نفس الامر میں کوئی انسان قرار نہیں پا سکتا۔ ممدوح کی ذات میں جو واقعی خوبیاں ہوتی ہیں اُن سے اصلاً تعارض نہیں کیا جاتا بلکہ بجائے اُن کے ایسی محال باتیں بیان کی جاتی ہیں جو کسی متنفس پر صادق نہ آسکیں ممدوح کی طرف اکثر وہ خوبیاں منسوب کی جاتی ہیں جن کے اضداد اُس کی ذات میں موجود ہیں۔ مثلاً ایک جاہل کو علم و فضل کے ساتھ ایک ظالم کو عدل و انصاف کے ساتھ۔ ایک احمق اور غافل کو دانشمندی اور بیدار مغزی کے ساتھ۔ ایک عاجز و بے دست و پا کو قدرت و تمکنت کے ساتھ وغیرہ۔

یہ عیب تمام فارسی اور اُردو قصیدہ نگاروں کے کلام میں موجود ہے صرف عربی شعرا ہی ہیں جن کا کلام اس عیب سے پاک ہے کیونکہ انھوں نے کبھی کسی ایسے شخص کی تعریف نہیں کی جس کو انھوں نے قابل تعریف نہ سمجھا ہو ہمارے قصیدہ گو دربار سے وابستہ تھے اس لئے اُن کو شکم پری کے لئے جھوٹی تعریف کرنا پڑتی تھی اور زمانہ کے معیار کے مطابق مبالغہ میں تخئیل کی بلند پروازی دکھانا پڑتی تھی۔ اس لئے مدح میں سوائے جھوٹ کے اکثر کچھ نہیں ہوتا تھا۔ انشاء کی مدحیات میں بھی یہ چیز بدرجۂ اتم موجود ہے۔

مدح کے بعد جو قصیدہ کا حصہ آتا ہے وہ خاتمہ کہلایا جاتا ہے۔ اس میں شاعر ممدوح کو دُعا دیتا ہے اور اپنے لئے کچھ طلب کرتا ہے۔ اس چیز کا معیار حُسنِ طلب ہے یعنی شاعر ممدوح سے اس طرح اپنی حاجت روائی اور کار براری کی التجا کرے کہ ممدوح کی طبیعت پر اس کی درخواست گراں نہ ہونے پائے بلکہ ممدوح کے دل میں محبت اور ترحم کے جذبات برانگیختہ کردے۔ نقادوں نے اس ضمن میں سوداؔ کی خوب خوب تعریف کی ہے مثال کے طور پر یہاں سوداؔ کے دو قصیدوں کے خاتمے نقل کئے جاتے ہیں بسنت خاں خواجہ سرا کی مدح میں جو قصیدہ ہے اُس میں سوداؔ کا حُسنِ طلب ملاحظہ فرمائیے :-

لیکن نہ سمجھو یہ تم اس گفتگو سے ہرگز، منظور مجھ کو تیری ہمت کا امتحاں ہو
کس واسطے کہ مجھ کو اتنا ہی چاہیئے ہے، جامہ ہو ایک بر میں کھانے کو نیم ناں ہو
سو تو زیادہ اس سے تیرا کرم ہے مجھ پر کفرانِ نعمت اوپر قادر نہ یہ زباں ہو
اتنی ہی آرزو ہے کچھ عمر ہو جو باقی، مصروف جہاں میں اُس کا تیرے خدم کے ہو
کب جا سکے ہے کوئی دروازے تیرے آکر بیٹھے جو تیرے در پر وہ سنگ آستاں ہو

سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں نائب اودھ کے قصیدہ میں مطلب کا اظہار سوداؔ نے اس طرح کیا ہے :-

غرض کہ اس لئے تیری یہ میں نہیں کی مدح کہ چاہوں تجھ سے میں اسکے صلہ میں درہم و دام
عوض میں اس کے صلے کی کروں میں تجھ سے عرض قبول ہو جو میرا حرف اے ذوی الاکرام
مجھے تو گوشۂ خاطر میں اپنے دے جاگہ کہ تا بسر کروں لیل و نہار با آرام

قصیدہ میں اسی حُسن طلب سے ملحق مقطع بھی ہوتا ہے۔ مقطع کی خوبی یہ ہے کہ اُس کے الفاظ اتنے شاندار اور پُرشوکت ہوں کہ تشبیب کے مقابلہ میں پست نہ معلوم ہوں تاکہ قصیدہ ختم ہونے پر سامع کے دماغ پر اچھا اثر قایم رہے۔ یہ چیز بھی سوداؔ کے قصاید میں بہت بلند پایہ ہے۔ سوداؔ کے دو مقطعے نقل کئے جاتے ہیں:-

غرض کروں ہوں دعاؤں پہ اپنے ختم سخن ادب کی مرضی ہے طولِ کلام ہو کوتاہ
الٰہی تا ہو جہاں تو ہو اور دنیا ہو جہانِ خوبی ہے تو اسے جہانیوں کی پناہ

کرے ہے ختم دعاؤں پر اب سخن سوداؔ ادب سے دور ہے خدمت میں تری طول کلام
الٰہی باغ جہاں میں ہو جب تلک ماتا شبیہ غنچہ صراحی سے شکل گل سے جام
مئے طہور تجھے دے ہر ایک عید کے دن طرف سے ساقی کوثر کے ساغرِ گلفام

اب انشاؔ کے قصاید میں یہی چیز ملاحظہ فرمائیے :-

در مدح نواب سعادت علی خاں :-

انشاؔ تری دعا میں ہے مشغول رات دن اپنے کریم و قادر و سبحاں کے سامنے

جب تک نہو کمال درخشندگی نصیب — جرم سہا کو مہر کے عماں کے سامنے
آساں رہیں یہ عقدہ کی غنچہ کشائیاں — تا ناخن نسیم بہاراں کے سامنے
افواج روم و شام و ولایت نہ ہوسکے — ہرگز کبھی ترے صفِ مژگاں کے سامنے
شایاں ہے یہی کہ تیری دست جود کا — مذکور کیجیے موسمِ باراں کے سامنے
ہرچند ہوں میں بے سر و ساماں ولیک آج — آیا ہوں تجھ سے باسر و ساماں کے سامنے
کلغی مجھے ملے تو تعجب نہیں کہ تھا — ہدہد کے سر پہ تاج سلیماں کے سامنے

در مدح جارج سوئم بادشاہ انگلستان :

اب دعا پر یہی انشاء کہو انشاء اللہ — مل کے آمیں کرو آمین سب اے اہلِ سخن
جب تلک مزرعۂ سرسبز ملک ہے شاداب — اسپہ انجم رہیں جب تک کہ ہے خرمنِ خرمن
جب تلک پھولیں پھلیں سارے یہ اشجارِ جہاں — جب تلک بادِ بہاری سے ہو زیبِ گلشن
جب تلک ماہ کے گھوڑے کی فلک ہو گھی — جب تلک شام کے ہو ساتھ شفق کی پلٹن
جب تلک چرخ کہن شکلِ گورنر میں رہے — صاحبِ شرق میں جب تک کہ ہوں جرنل کے چلن
شاہ انگلش یہی جارج رہے با عظم و شکوہ — سب کو بخشا کرے نت سیم و طلا لاکھوں من
فتح و فیروزی و شادی رہیں سب اُسکے نصیب — طبع اقدس کے ملالت نہ پھرے پیرامن
کمپنی نور کی جب تک کہ رہے قایم — بادشاہی رہے اُس کی ہی بوجہ احسن
جب تلک کرسئ زرینہ پہ خورشید رہے — رونق افزائے فلک خلعت شالم نہ پہن
ناظم الملک بہادر سے اور انگریزوں سے — رابطے یوہیں رہیں اور محبت کے چلن
یہی خواہش ہے میری جبکہ الٰہی سُن لے — دولت و حشمت و ثروت پہ کریں وہ قدغن
کہ نجاویں کہیں بے حکم انھیں دونوں کے — کبھی آپس میں کسی ڈھب سے نہ ہوئے ان بن

دونوں سرکاروں کا اقبال رہے روز افزوں
دوست سب شاد ہوں پامال رہیں دشمن

در مدح سعادت علی خاں :-

کنوں برائے دعا جبہہ بر زمیں سایم — کہ نیست ناطقہ ام را بمدحتِ تو مجال
بحق اشہد ان لا الہ الا اللہ — بحق مرتبۂ عالی اذانِ بلال ،
امام ضامن ثامن ترا نگہدارد — بعیش و صحت و آرام تا صد و سی سال ،

بنور حضرتِ مشکلکشا درخشاں باد — مہ جمالِ تو و آفتاب جاہ و جلال
امید وار رسید است سید انشاہم — حضور ہمچو تو دستور صاحبِ اقبال
امید او تو بر آور کہ تا امید توہم — بر آورد ز کرم زور ایزد متعال

در مدح شہزادہ سلیماں شکوہ :-

ترا نہ سنج دعائہ میشود ناچار — کہ سینہ ہائے عنادل نمودہ ناطقہ شق

بحیثیت مجموعی قصیدہ نگاری میں انشاؔ کا پایہ بلند ہے۔ رحمت نبی خاں ایم-اے (علیگ)

دی مغل لائن لمیٹڈ

(سب سے پرانی ہندوستانی جہازراں کمپنی)

بحر احمر اور ماریشس

کی بندرگاہوں کو مسافر اور مال لے جانے والے جہازوں کا بیڑہ بمبئی سے :-

عدن، پورٹ سوڈان، جدّہ اور مصر

کی بندرگاہوں کے درمیان ہمارے جہازوں کی آمد و رفت باقاعدگی اور خوش اسلوبی سے ہوتی ہے۔ اور امید ہے کہ ہم حسب ضرورت دوسری بندرگاہوں کو بھی اپنے جہاز بھیج سکیں گے۔

خاص حج سروس

جو حضرات حج کی سعادت حاصل کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں، وہ مندرجۂ ذیل پتہ پر اپنی درخواستیں جلد بھیج دیں۔ لیکن یہ امر ملحوظ رہے کہ جہاز میں جگہ ملنے کی گارنٹی نہیں دی جا سکتی :-

ٹرنر مارلیسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۶ - بنک اسٹریٹ بمبئی

مکتوباتِ نیاز

حضت - ایک زمانہ کے بعد آپ نے یاد بھی کیا تو کس "ادائے تُرکانہ" سے !

اللہ، اللہ ! ——— "زورِ دگر ست ایں کماں را" ——— !

یعنی یونہی بظاہر خطاب مجھ سے ہے، لیکن در اصل روئے سخن ہے کسی اور کی طرف ——— اور "وہ اور" بھی کون ———

"نامسلمانے کہ غارت می زند بر عقل و ہوش"

بندہ نواز — طاعت و بندگی کے امتحان میں اس قدر استبداد سے کام نہ لیجئے۔ اسی طرح کے سجدہ سے انکار اسوقت بھی ہوا تھا جب آدم کے سامنے سر جھکانے کا سوال پیدا ہوا تھا اور آیندہ بھی ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ "دعوائے وارستگی" انسان کا فطری حق ہے اور شاید یہیں سے وہ راہ پھوٹتی ہے جو خداوندی کی منزل تک پہونچتی ہے۔ پھر خدا کا انکار تو آپ کر سکتے ہیں، لیکن خداوندی کا نہیں۔

مجھے آجکل فرصت ضرور ہے، لیکن جرأت نہیں اور اگر ہو بھی تو میں ان سے جاکر کیا پوچھوں اور کیا کہوں — اُن میں رواداری نہیں، تو آپ ہی صبر سے کام لیجئے۔

اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را

قبلۂ نیاز منداں

گرامی نامہ جس کے ایک ایک لفظ سے آپ کی تشویش ظاہر ہے، کل پہونچا۔ میں نے اس واقعہ کو بالکل دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھا ہے۔ ہر چند عمر کی جس منزل سے میں گزر رہا ہوں، اس میں حسرت و یاس کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا لیکن معلوم نہیں کیوں، اس خاص مسئلہ میں، اپنی امیدوں کو از سرِ نو زندہ ہوتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ ممکن ہے آیندہ آپ بھی میرے ہمنوا ہو جائیں۔

پاکستان کا عزم مبارک ہو، لیکن جانتا ہوں کہ وطن کی گلیاں آپ کو پھر کھینچ بلائیں گی اور ہو سکتا ہے کہ

آپ جب واپس آئیں تو گھر زیادہ عزیز نظر آئے۔

جناب من

قیامت ہے۔ آپ بھی اسی تنگ نظری کا شکار ہیں، جس سے شبلی تک نہ بچ سکے، خیر بیدل کے متعلق تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے یہاں زبان کا لطف نہیں۔ کیونکہ اس کی شاعری زبان کی شاعری تھی ہی نہیں، لیکن نسبتی کا نام سُنکر تاک بھوں چڑھانا، محض اس بنا پر کہ اسے تھانیسر سے نسبت تھی۔ بڑا ظلم ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ آپ نے اس کا کلام دیکھا ہی نہیں، ورنہ آپ ایسا خوش ذوق و خوش فکر انسان ایسا نہ کہتا۔

نسبتی کی شاعری، محض تغزل کی شاعری ہے اور نہ صرف جذبات کی بلندی و پاکیزگی بلکہ زبان کی حلاوت اور طرزِ بیان کی خوبی و ندرت کے لحاظ سے بھی "قدرِ اول" کی چیز ہے۔ وہ عشق و محبت کے صحیح و پاکیزہ تاثرات کو ایسے لطیف و بیساختہ انداز سے ظاہر کرتا ہے کہ سعدی اور خسرو دونوں بیک وقت ہمارے سامنے آجاتے ہیں اور ہم ایسا محسوس کرنے لگتے ہیں کہ نسبتی کی آواز خود ہمارے دل کے اندر سے نکل رہی ہے۔

تذکروں میں اس کا نمونۂ کلام دو چار شعروں سے زیادہ نہیں پایا جاتا، شاید اس لئے کہ اس کا دیوان نایاب ہے، لیکن آپ تو ایسا نہ کہئے اس کا پورا دیوان آپ کی نگاہ سے گزر چکا ہے۔ حیران ہوں کہ آپ نے کس نگاہ سے، کس عالم میں اس کا مطالعہ کیا ہے۔

اگر ناگوار نہ ہو تو اس کے چند اشعار میں بھی حاضر کروں، ممکن ہے آپ کے نسخہ میں یہ نہ پائے جاتے ہوں:۔ زبان کی حلاوت و سادگی اور بیان کی شگفتگی و روانی ملاحظہ ہو:۔

بگزار تا دمے ز شکایت تہی کنم — در سینہ می خلد گلۂ ناتمام ما
اے آنکہ بیغمانہ روی از کنارِ ما — آگاہ نیستی مگہ از انتظارِ ما

جوش و خروش

گرد از سرِ کوئے یار برخاست — آہے زدم و غبار برخاست

از خونِ دلم شیشۂ مے زہر بجام ست — بر حوصلۂ جامِ جم ایں بادہ حرام ست
ہجرش از آب می برآرد دود — وصلش از شعلہ می چکاند آب
ما از دل و از کامِ دلِ خویش گزشتیم — امروز اجابت نتواں داشت دعا را
اشک ریزاں می روم در وادیٔ آوارگی — تا کجا خواہم فشرد ایں دامنِ نمناک را

محبت کی تلخکامی

تو اے جاں در نمی آئی، دل از جا در نمی آید — کسے تا چند بر پا دارد ایں آرام و تسکیں را

نے وعدہ، نے امید، تو خود گو جواب چیست — پرسند گر ز ما سببِ انتظارِ ما

چارہ نتواں کرد دردِ کہنہ و دیرینہ را — دست بر دل می نہادم پارہ کردم سینہ را

در دلِ سنگینِ آں بیرحم تاثیرے نہ کرد — نسبتی بر گریۂ خود خندہ می آید مرا

ما نسبتی از بزم طرب بخت نداریم — تہمت بہ خم و بادہ و ساغر نتواں بست

پیوندِ دل از ہمہ بریدیم، — دیرے ست کہ خاطرم بجا نیست

نسبتی یک جرم را صد عذر گفت — گرچہ تقصیرے کہ می باید، ندانشت

سپردگی عشق

سرِ من گر بودت در نہ بود رنجش نیست — چہ تواں کرد مرا با تو سرے افتاد ست

مُردیم و بود در دل حرفے کہ با تو گویم — در خاک رفت با ما رازِ نہانیِ ما،

از روز و شبِ نسبتی احوال چہ پرسی — ہر صبح گرفتارِ تو، ہر شام اسیر ست

محاورہ و زبان

بدنامیٔ تازہ بر انگیخت دست گرد — طشتے دگر فتادہ ہمانا ز بامِ ما

بزم جم آخر شد و وقتِ صبوح ما رسید — طرحِ دیگر می تواں انداخت دورِ جام را

در ہر کہ بنگرد غلطِ یار می خورد — چشمِ خطا نظارہ ندانم چہ دیدہ است

گل ہمہ گوش ست لیکن صوتِ بلبل نارساست — نالہا کوتاہ افتادست، جرمِ گوش نیست

پیوندِ دل از ہمہ بُریدیم، — دیرے ست کہ خاطرم بجا نیست

موقوف بہ خنجرِ دگر شد، — آسایشِ نیم بسملِ ما،

شوخی و حُسنِ تعبیر

در نسخۂ نسبتی ست یک نام — عنقا و وفا و کیمیا را

قرباں شوم ابروِ بتاں را — زورِ دگر ست ایں کماں را

وراے عشوہ و ناز و خرام و رعنائی — دگر ہزار بلا ہمرہ ست بالا را

نمود وعدۂ قتلم دو چشمِ او لیکن — چہ اعتماد تواں کرد قولِ بتاں را

سمجھ میں نہ آنے والے واقعات

ڈین شیفر ولایت کا ایک مشہور شخص ہے، جس کا شوق صرف یہ ہے کہ وہ دنیا کے عجیب وغریب واقعات کی تحقیق کرے اور ان کے وقوع کے صحیح اسباب کا پتہ چلائے۔ جس وقت اس کو کسی ایسے واقعہ کا علم ہوتا ہے تو وہ تحقیق کے لئے خود جاتا ہے یا اپنے ایجنٹوں کو متعین کرتا ہے کہ وہ پوری تفتیش کے بعد واقعہ کی حقیقت معلوم کریں لوگ ملک کے ہر گوشہ سے اسکی طرف رجوع کرتے ہیں اور وہ ان واقعات کی تحقیق میں مصروف ہو جاتا ہے۔

اس کا بیان ہے کہ اسوقت تک ۵۰۰ واقعات اس کو ایسے معلوم ہوئے ہیں جن کی باوجود انتہائی کوشش کے وہ کوئی تاویل نہیں کر سکا، منجملہ ان کے چند یہ ہیں:

۱۔ اسٹراڈم کے جوار میں ایک ڈاکٹر وان ڈرہویگ رہتا ہے، اس نے اپنی زندگی کا ایک عجیب وغریب واقعہ لکھ کر بھیجا اس کا بیان ہے کہ "ایک بار آدھی رات کے قریب کسی نے میرا دروازہ کھٹ کھٹایا، میں سو رہا تھا، گھبرا کر اُٹھ بیٹھا اور دروازہ پر پہونچا، دیکھا کہ ایک لڑکا ہاتھ میں ایک خط لئے کھڑا ہے۔ میں نے خط پڑھا تو اس میں لکھا تھا کہ "ایک خاتون سخت بیمار ہے فوراً تکلیف کیجئے"، میں فوراً کپڑے پہنکر اس کے ساتھ ہولیا۔ وہ مجھے ایک گھر میں لے گیا جو کسی دولتمند شخص کا معلوم ہوتا تھا۔ ملازم مجھے اندر لے گیا تو دیکھا کہ ایک بہت خوبصورت خاتون بستر پر لیٹی ہوئی ہے، اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا "ڈاکٹر صاحب میں خیال کرتی ہوں کہ میری موت کا وقت قریب آگیا ہے۔ اگر آپ کچھ کر سکتے ہوں تو کیجئے"۔

میں نے اس کو اچھی طرح دیکھا اور نسخہ لکھ کر کہا کہ فوراً یہ دوا منگوا کر پیجئے، امید ہے آپ اچھی ہو جائیں گی اور میں کل آکر پھر دیکھوں گا۔ دوسرے دن پہونچا تو میں نے دیکھا کہ مکان بالکل ویران ہے اور اس کے دروازے اور کھڑکیاں بہت عرصہ سے بند معلوم ہوتی تھیں، کیونکہ ان کی چٹخنیاں اور قبضے وغیرہ علاوہ خاک سے ڈھکے ہونے کے زنگ آلود بھی تھے۔ قریب ہی کی جھاڑی سے ایک ضعیف شخص نے پوچھا "آپ کس کی تلاش میں ہیں" دس سال ہوئے یہاں ایک خاتون رہتی تھی اور اس کی موت کے بعد یہ مکان خالی ہو گیا اور اسی وقت سے بند ہے۔ میں نے کہا "پاگل ہوا ہے کیا۔ رات ہی کو تو میں یہاں آیا تھا"

وہ بولا:۔ "کنجیاں میرے پاس ہیں لیکن میں خود بھی اس کے اندر کبھی نہیں گیا، آیئے اندر چل کر دیکھیں"

اندر پہونچکر دیکھا کہ ہر چیز خاک آلود ہے، چاروں طرف لکڑی کا جالا نظر آتا ہے اور خوابگاہ میں نمائی مسہری خاک سے

اٹی ہوئی ہے"۔ اس شخص نے مجھ سے کہا " آپ نے دیکھا، میں غلط تو نہ کہتا تھا" میں مکان کی یہ حالت دیکھ کر حیران رہ گیا، لیکن اتفاق سے میری نگاہ کاغذ کے ایک ٹکڑے پر پڑی جو بستر کے پاس فرش پر پڑا ہوا تھا، میں نے اسے اُٹھا کر دیکھا تو حیرت کی انتہا نہ رہی، کیونکہ یہ وہ نسخہ تھا جو میں نے رات کو بیمار خاتون کے لئے لکھا تھا۔

۲۔ گرین لینڈ کے سمندر میں دھیل مچھلی کا شکار کرنے والے ایک جہاز کو دور سے ایک جہاز نظر آیا، اس نے سگنل دیا تو اُدھر سے کوئی جواب نہ ملا، کپتان نے خیال کیا کہ شاید یہ پانی کے برفیلے حصہ میں پھنس گیا ہے اور فوراً کچھ آدمی لیکر ایک کشتی کے ذریعہ سے وہاں پہونچا۔ یہاں پہونچکر دیکھا کہ جہاز کے چاروں طرف برف جمی ہوئی ہے اور بادبان بھی منجمد ہے۔ تختۂ جہاز پر پہونچکر دیکھا کہ ایک ملاح جہاز کی رسیوں پر چڑھے ہوئے اسی حالت میں جم گیا، آگے بڑھے تو اور کئی آدمی مختلف کام کرنے کی حالت میں منجمد پائے گئے۔ کپتان کے کمرے میں پہونچے تو دیکھا کہ وہ کرسی پر سیدھا بیٹھا ہوا ہے اور اس کے ہاتھ میں پر کا قلم ہے، سامنے ایک کاغذ پر وہ کچھ لکھ رہا تھا کہ اسی حالت میں منجمد ہوگیا، کاغذ پر جو تاریخ نظر آئی اس سے معلوم ہوا کہ یہ واقعہ ۱۶ سال قبل کا ہے۔

۳۔ سان جوان میں ایک ڈاکٹر تھا جس کا نام پرٹوریکو تھا۔ وہ اسی جزیرہ کے محکمۂ پبلک ہیلتھ میں ملازم تھا اور بیوی بچے سمیت یہیں رہتا تھا۔ ایک رات اس کی بیوی نے کہا کہ میں اپنے عزیزوں سے ملنے جانا چاہتی ہوں۔ وہ یہ کہکر چلی گئی اور ڈاکٹر سوگیا۔ چند گھنٹوں کے بعد اس کی بیوی واپس آئی تو سخت بدحواس تھی اور وہ آتے ہی اپنے شوہر پر برس پڑی کہ تم مجھے تنہا چھوڑکر کیوں چلے آئے۔ ڈاکٹر یہ سنکر حیران رہگیا اور بولا کہ " یہ تم کیا کر رہی ہو، میں تو کہیں گیا ہی نہیں، اور تمہارے جانے کے بعد ہی سوگیا تھا" لیکن اس نے کہا کہ " تم غلط کہتے ہو، راستہ میں جب میں ریل کی سڑک سے گزری تو دفعتاً ریل آگئی اور تم نے دوڑکر مجھے بچالیا، لیکن اس کے بعد ہی تم دفعتاً غائب ہوگئے اور اب تم کہتے ہو کہ یہاں سے باہر کہیں گئے ہی نہیں"

۴۔ خود ڈین شیفر کا ایک تجربہ۔

" میں نبراسکا میں تھا۔ ایک رات موٹر پر ہوٹل جاتے ہوئے ایک کھیت کے قریب سے گزرنا ہوا تو دیکھا کہ کھیت میں ایک جگہ بڑی تیز روشنی ہو رہی ہے، ہم نے موٹر روک دیا تو وہ روشنی ایک روشن گیند کی شکل میں سڑک کے متوازی حرکت میں آئی اور پھر آسمان کی طرف بلند ہوکر غائب ہوگئی۔

۵۔ آسٹریا میں ایک قصبہ ہے گراس وارڈن اس کے پادری جوسف ڈی لانی کو ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔

۱۹۱۴ء میں جون ۲۸ کی رات تھی، پادری جب اپنے مطالعہ کے کمرے میں گیا تو اس نے دیکھا کہ ایک خط لمپ کے پاس رکھا ہے کھول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ خط آرک ڈیوک فرڈننڈ کا ہے۔ اس نے یہ خط پڑھ کر وہیں رکھدیا اور نوکر کو بلانے کے لئے گھنٹی بجانے گیا لیکن جب واپس آیا تو خط غائب تھا۔ اس نے اپنے حافظہ سے کام لیکر خط کی عبارت کو ایک کاغذ پر لکھ لیا اور نوکر کو بلا کر کہا کہ تم گواہ رہو کہ یہ خط میں نے اپنے حافظہ کی مدد سے لکھا ہے۔ خط کی عبارت یہ تھی:۔

"میں اور میری بیوی ایک سخت سیاسی تحریک کا شکار ہوئے ہیں، اپنی دعاؤں میں ہمیں یاد رکھئے"

اس کے دس گھنٹے بعد اخبار میں یہ خبر شایع ہوئی کہ پچھلی رات سراجیو میں آرک ڈیوک کو قتل کر دیا گیا اور یہ وہی واقعہ تھا جو ۱۹۱۴ء کی عالمگیر جنگ کا باعث ہوا۔

۵۔ دارٹ فورڈ (انگلینڈ) میں ایک خوشحال شخص تھرسٹن کا کرتا تھا۔ ایک رات اس کی بیوی اپنے اعزہ سے ملنے دوسرے گاؤں چلی گئی تو رات کو دو بجے اس کے مکان سے آگ کے شعلے بلند ہوتے ہوئے دکھائی دئے۔ آگ بجھانے والے پہونچے لیکن آگ نہ بجھ سکی اور مکان جل کر خاک سیاہ ہوگیا۔ صبح کو جاکر دیکھا تو وہ کمرہ جس میں تھرسٹن سویا تھا بدستور محفوظ تھا اور اندر سے بند۔ دروازہ توڑ کر اندر گئے تو دیکھا کہ تھرسٹن مُردہ ہے، اس کا لباس، بستر اور خوابگاہ کا تمام سامان محفوظ ہے۔ لیکن جب اس کے کپڑے اُتارے گئے تو معلوم ہوا کہ سارا جسم جھلسا ہوا تھا۔

مسٹر پلے فیر باشندۂ کنٹ صبح ناشتہ کے بعد اپنا اصطبل دیکھنے گئے جس میں ان کے متعدد گھوڑے رہتے تھے۔ ایک گھوڑا انھیں بہت پسند تھا سب سے پہلے اس کے کوٹھری کا دروازہ کھولا جو مقفل تھا لیکن وہ دیکھ کر حیران رہگئے کہ گھوڑا غائب ہے۔ اسی کوٹھری سے ملی ہوئی گھاس رکھنے کی کوٹھری تھی جس کا دروازہ اتنا تنگ تھا کہ آدمی بھی اس کے اندر مشکل سے جا سکتا تھا۔ پلے فیر نے اس کوٹھری کو کھولکر دیکھا تو گھوڑا اس کے اندر موجود تھا اور گھاس کھا رہا تھا۔ آخر کار یہ دروازہ توڑ کر گھوڑے کو باہر نکالا گیا۔

ڈین شیفر جو لندن کے ریڈیو اسٹیشن سے اپنے اس قسم کے تجربات نشر کرتے رہتے ہیں، اخیر میں ظاہر کرتے ہیں کہ سائنس باوجود اتنی ترقی کے اب بھی بہت سی باتوں کے سمجھنے سے عاجز ہے۔

بھول نہ جایئے

کہ "نگار" کا سالانہ چندہ اب علاوہ محصول چھ روپیہ ہے

باب المراسلہ

یک گریہ پس از ضبطِ دو صد گریہ رضادہ
تا تلخیٔ آں زہر تواں زگلو بُرد

حضرت قبلہ — ہندوستان کی سرزمین کو چھوڑے ہوئے کئی ماہ ہو چکے ہیں۔ لیکن ہندوستان کی زندگی کے نقوش ہنوز دل و دماغ پر مستولی ہیں۔ ماہِ نومبر میں آگرہ کو خیرباد کہکر ماہِ دسمبر کے پہلے ہفتہ میں کراچی پہونچا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس زندگی کو جو ہندوستان میں بسر ہوئی یہاں آکر بالکل بھول جانا چاہئے کیونکہ یہاں فکر و نظر کی وہ رعنائیاں جو میرے نزدیک روح کا سب سے زیادہ متاع گرانمایہ کہی جا سکتی ہیں زندگی کی عریاں حقیقتوں کے سامنے ابخرات بن کر اُڑتی جا رہی ہیں۔ اس درمیان میں کہ نہیں سکتا آپ کتنی بار مجھ کو یاد آئے اور کتنے مرتبہ میں نے آپ کے خیال کو فراموش کرنا چاہا۔ کیونکہ آپ کا یاد آنا گویا شعر و ادب اور علم و حکمت کا یاد آنا ہے اور یہ چیز یہاں کے ماحول میں ایک گناہ ہے۔ آپ کو مایوسی تو ہوگی لیکن سچ یہ ہے کہ آجکل مجھے Theophile Gautier کی طرح ادیبوں، نقاشوں اور مفکروں سے ایک نوع کی گھبراہٹ محسوس ہونے لگی ہے۔ عرصہ تک ان کی تخئیل میں رہ کر زندگی کی حقیقتیں اور زیادہ تلخ ہو جاتی ہیں۔ تخئیل اور حقیقت کی جنگ کو ان لوگوں نے اور زیادہ سنگین بنا دیا ہے۔ تاہم ہنوز آتشِ احساس بالکل سرد نہیں ہو سکی ہے۔ آپ کو حیرت ہوگی — کچھ دن ہوئے میں نے ایک صبح آپ کو خواب میں دیکھا، میں نے کہا "زہے مراتب خوابے کہ بہ زبیداری ست" میں نے اُسی دن آپ کو ایک طویل خط لکھا لیکن بعد کو اس خیال سے کہ بیکار آپ کا وقت ضایع ہوگا، اس کو پھاڑ کر پھینک دیا۔ تقریباً پرسوں جب میں شاید Parliamentarian Secretariat کے قریب سے گزر رہا تھا میں نے ایک صاحب کو وکٹوریہ میں جاتے دیکھا — میں کہہ نہیں سکتا، اس سے پہلے آج تک اس نوع کا اتفاق نہیں ہوا، یکایک میرے دل کی حرکت تیز ہو گئی وہ شخص جس کی میں نے صرف ایک جھلک سی دیکھی تھی، آپ سے بے حد مشابہ تھا۔ یہ تو آپ کو علم نہیں ہے کہ مجھے آپ سے شرفِ نیاز حاصل نہیں ہے، لیکن میں نے آپ کی وہ تصویر دیکھی ہے جو ایک بار ۱۹۲۸ء کے "نگار" میں شایع ہوئی تھی۔ میں کیا عرض کروں وہ شخص آپ کی اس تصویر سے کس درجہ مماثل تھا — مجھے ابھی تک پورے طور پر یقین نہیں ہے کہ وہ "آپ" نہیں تھے۔ بظاہر واقعہ ایسا نہیں تھا جس کے بعد میں زیادہ عرصے تک خاموش رہ سکتا لیکن آج پھر ایک اور تحریک ہوئی۔ پُرانے کاغذات دیکھ رہا تھا کہ اُس میں آپ کے وہ خطوط جو آپ نے ازراہِ لطف و کرم مجھ کو میرے خطوط کے جواب میں تحریر فرمائے تھے، سامنے آگئے۔ اب میں ضبط نہ کر سکتا تھا، اب میں آپ سے دو چار باتیں کرنے کے لئے بیتاب تھا۔

آج ہوا میں قدرے خنکی زیادہ ہے اور آسمان پر بھی ہلکے ہلکے بادل تیر رہے ہیں۔ ساری فضا شراب آلود معلوم ہوتی ہے۔ غالب کی زبان میں "روزِ ابر" شاید ایسے ہی دن کو کہتے ہوں گے۔ خیر، شراب تو قسمت والوں کی چیز ہے، یہ بھی کیا کم ہے کہ میں اس شخص سے اس وقت خطاب کر رہا ہوں جو یکسر شعر و شراب ہے۔

قبلہ! زندگی کی جن کثافتوں سے آجکل گزر رہا ہوں اُن کا خیال بھی ہمت شکن ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب تک جس چیز کو سرمایۂ حیات تصور کرتا رہا اور جس زندگی کی تعمیر اس وقت تک میرا مطمحِ نظر بنی رہی ہے، اس کو اب مجھکو جلد ہی دفن کر دینا ہوگا! ابتک میں انسانی زندگی کو بہت گراں قیمت سمجھتا تھا، اب ظاہر ہو رہا ہے کہ روئے زمین پر اس سے زیادہ ارزاں کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ حالات مجبور کر رہے ہیں کہ میں بھی اپنی زندگی کا سودا انتہائی سستے داموں پر کر دوں۔ ابھی تک خود کو اس پر طیار نہیں پاتا، لیکن اگر لیل و نہار یہی ہیں تو ناممکن بھی ممکن ہو جائے گا ——— اور پھر اگر کوئی شخص دُنیا کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دے تو بھی دُنیا اس کے ساتھ کیا کرتی ہے۔ دُنیا نے مہاتما گاندھی کے ساتھ کیا کیا؟ —— گاندھی کی موت پر برنارڈ شا کا یہ جملہ میرے دل پر نقش ہو کر رہ گیا ہے:۔ "He shows how dangerous it is to be too good"

(دنیا میں اچھا ہونا واقعی سب سے زیادہ خطرناک چیز ہے) معاف فرمایئے گا میرا عقیدہ ہے کہ دُنیا نے حضرتِ علی علیہ السلام (فداہ ابی و امی) کے ساتھ بھی یہی ناروا سلوک کیا۔ دُنیا میں کتنے کتنے اور کیسے کیسے لوگ آئے، اُنھوں نے کیا کچھ نہ کہا، کیا کچھ نہ کیا، لیکن افسوس! انسان کو اپنی غلطیوں پر اصرار ہے، دُنیا کی آشوب کاریاں یوں ہی باقی ہیں —— اور شاید یونہی باقی رہیں گی!

آج کل ابو طالب کلیم کا یہ شعر بار بار دل میں چُبھ رہا ہے!

طبعے بہم رساں کہ بسازی بعالمے باہمتے کہ از سرِ عالم تواں گزشت

تاحال اپنے کو دنیا کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے میری فطرت آمادہ نہیں ہوتی، البتہ ذاتی طور پر مجھ میں وہ ہمت ضرور ہے جس کا کلیم نے دوسرے مصرع میں مطالبہ کیا ہے، خدا سے دعا ہے کہ اُن علائق کی گرفت قدرے ڈھیلی ہو جائے جس کے باعث اسکو بروئے کار آنے میں جھجک ہو رہی ہے۔

بہر حال کیا عرض کروں، عجیب کیفیت ہے جس کو صرف disillusionment سے تعبیر کیا جا سکتا ہے —— دل کہتا ہے "die or do" !!

میری دُعا ہے —— اور اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کو بھی اس دُعا میں شریک کر لوں —— کہ خدا جلد "نجات" دے!

والسلام نیازمند: م۔ح

آپ کا خط اسوقت ملا جب میں آپ کے طویل سکوت کا سبب آپ کی ناگزیر "گمشدگی" کو قرار دیکر بالکل مایوس ہو چکا تھا۔ آپ کے پچھلے خط سے (جو کئی مہینے اُدھر آپ نے لکھا تھا) اجمالاً یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ حوادثِ زندگی کا مقابلہ کرنے کے لئے آپ کسی

"ناگوار اقدام" پر مجبور ہیں۔ لیکن اس کی نوعیت کا علم مجھے نہ تھا۔ اب درد و درماں دونوں کا حال معلوم ہوا۔

میں نے آپ کو پہلے بھی لکھا تھا اور اب پھر لکھتا ہوں کہ انسان محض پرستشِ خیال کے لئے وضع نہیں ہوا۔ اگر فطرت کا مقصود یہ ہوتا کہ انسان صرف سوچتا رہے تو دماغ کے سوا وہ کچھ نہ ہوتا۔ لیکن خدا نے اس کو ہاتھ دئے ہیں تاکہ پھاوڑا لیکر زمین کھودے اور پاؤں دئے ہیں تاکہ وہ ایک جگہ نچلا نہ بیٹھ سکے۔ اس لئے آپ کو شکر ادا کرنا چاہئے کہ آپ وہاں پہونچ گئے جہاں فکر و خیال کی رعنائیاں مفقود ہیں اور زندگی کی حقیقتیں بے نقاب!

اگر آپ ادیبوں، نقادوں اور مفکروں سے گھبرانے لگے ہیں، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے اندر ایک عملی انسان پیدا ہو رہا ہے اور اس کیفیت کو دور کرنے کی کوشش نہ کیجئے۔ دنیائے فکر و احساس دنیائے عمل کی ضد نہیں، بلکہ اس کی تمہید ہے۔

عواطف و جذبات (Sentiments) اور عمل غایت کے لحاظ سے دونوں کا ایک مخصوص مقصد ہوتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ صحیح Sentiment وہی ہے جس کی غایت عمل کے Ideal سے ٹکرائے نہیں بلکہ اس میں جذب ہو جائے۔

آپ سرزمین تاج کو چھوڑ چکے ہیں، جو واقعی رعنائی خیال کی جولانگاہ ہے اور اب پاکستان میں ہیں، جہاں آپ حقیقتوں کی طرف سے آنکھ بند کر کے زندگی نہیں گزار سکتے۔ خواب میں کافی وقت بسر کیا ہے، اب کچھ دن بیداری میں بھی صرف کیجئے اور اپنے ساتھ اہل پاکستان کو بھی درسِ بیداری دیجئے۔

اگر میری یاد آپ کو "مے و رامش و رنگ و بوئے" کی طرف مائل کرتی ہے تو مجھ پر لعنت بھیجئے اور آنکھ بند کر کے اپنے آپ کو حرکت و عمل کے سیلاب میں ڈال دیجئے۔

در رہِ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں
شرطِ اول قدم آں ست کہ مجنوں باشی

نیاز

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے والی

انجیلِ انسانیت

"من و یزداں"

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دورِ تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ۔ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوعِ انسانی کو "انسانیتِ کبریٰ و اخوتِ عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔ اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقاید، رسالت کے مفہوم اور صحایفِ مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پُرزور خطیبانہ انداز میں بحث کیگئی ہے۔ ضخامت ۶۷۲ صفحات۔ مجلد قیمت مع علاوہ محصول ۸

گرد پوش رنگین — منیجر نگار بک ایجنسی لکھنؤ — کاغذ سفید دبیز

معلومات عامہ

آٹم بم سے زیادہ مہلک ایجاد

ہروشیما اور ناگاسکی پر آٹم بم کے گرائے جانے اور ان دونوں شہروں کے خاک سیاہ ہو جانے کا واقعہ پچھلی جنگ کا خاص واقعہ ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ آٹم بم کے نام سے کانپنے لگے اور امریکہ نے یہ کہہ کہکر کہ آٹم بم کا راز اسی کو معلوم ہے اور کثرت سے اس کے پاس موجود ہے، ساری دنیا کو اپنی طرف سے خوفزدہ بنا دیا، لیکن ذہن انسانی جو کبھی کسی ایک چیز پر قانع نہیں رہ سکتا، اس نے سوچنا شروع کیا کہ کیا آٹم بم کو اس سے زیادہ قوی بنایا جا سکتا ہے، اور آپ یہ سُنکر حیرت کریں گے کہ پچھلے سال ڈیڑھ سال کے اندر آٹم بم اس قدر ہولناک چیز ہو گیا ہے کہ ہروشیما اور ناگاسکی کے بم اس کے سامنے کھلونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

آٹم بم کی ایجاد نے دُنیا کی تمام سلطنتوں کو سخت فکرمند بنا دیا ہے اور ہر ملک اپنی جگہ سوچ رہا ہے کہ اس اندیشہ سے کیونکر نجات مل سکتی ہے اور باوجود کوشش کے اس وقت تک اقوام عالم نہ آٹم بم کی ساخت کو ممنوع قرار دے سکیں اور نہ اس کا کوئی توڑ ایجاد کر سکیں، لیکن اگر بفرض محال ایسا ہو بھی جائے اور آٹم بم بنانے کے تمام ذرایع مسدود ہو جائیں، تو بھی سوال یہ ہے کہ کیا انسان اب اس کرہ میں حفاظت سے رہ سکتا ہے؟ - افسوس ہے کہ اس کا جواب آپ کو نفی میں ملے گا۔

اس وقت دنیا کی بعض بڑی قوتوں کے پاس ایسے ایسے کیمیاوی، حیاتیاتی اور فضائی قسم کے آلات پائے جاتے ہیں کہ ان سے نہ صرف روئے زمین کے تمام انسان بلکہ حیوانات و نباتات بھی آن کی آن میں صفحۂ ہستی سے مٹائے جا سکتے ہیں - یہ آلات صرف امریکہ کی تنہا ملکیت نہیں ہیں، بلکہ بہت سی قومیں ان کو طیار کر رہی ہیں اور زیادہ آسانی کے ساتھ، کیونکہ آٹم بم کے لئے جس سامان کی ضرورت ہوتی ہے وہ بہت قیمتی و کمیاب ہے، مگر اس کو نہایت معمولی اور ارزاں دھاتوں اور چیزوں سے ایک معمولی صنعتی کارخانہ بھی طیار کر سکتا ہے — اس دنیا کے مہلک ترین آلۂ حرب کے وجود کا حال کسی قوم نے ظاہر نہیں کیا، لیکن اس دوران میں بعض لوگوں کی تحریروں میں اس کی طرف کھلا ہوا اشارہ پایا گیا ہے — ۱۹۴۶ء میں امریکہ کے ایک ذمہ دار شخص نے ظاہر کیا کہ: "امریکہ کے پاس ایک ایسا خفیہ حیاتیاتی (Bilological) آلۂ حرب ہے جو آٹم بم سے کہیں زیادہ ہلاکت آفریں ہے"۔ اس نے یہ بھی کہا کہ "امریکہ کے سائنس دانوں نے کیلی فورنیا کی یونیورسٹی میں ایک ایسا آلۂ حرب ایجاد کیا ہے کہ بڑے سے بڑے شہر کی تمام آبادی کو چشم زدن میں ختم کر سکتا ہے" — اس کے ایک ہفتہ بعد ایک مشہور سائنس داں نے ظاہر کیا کہ امریکہ کے پاس اس قسم کے تین خفیہ آلات حرب ہیں اور پھر معلوم ہوا کہ ان کی تعداد پانچ ہے۔

دوران جنگ میں اور اس سے پہلے بھی دنیا میں خبر مشہور ہوئی تھی کہ جرمنی نے ایک ایسی شعاع دریافت کر لی ہے جس کے

پڑتے ہی انسان ہلاک ہو جائے گا اور اس کا نام Death Ray ہے۔ اسی کے ساتھ یہ افواہ بھی پھیلی کہ مہلک بیماریوں کے جراثیم پھیلانے والے بم بھی طیار کئے جا رہے ہیں۔ لیکن ان خبروں کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ جرمنی، جاپان امریکہ، برطانیہ اور کناڈا ہر جگہ جراثیم پھیلانے والے بموں کے متعلق تحقیق جاری تھی اور امریکہ کے ایک سائنس داں نے صاف صاف بتا دیا تھا کہ Botulinus Toxin کی ایک گرین مقدار ستر لاکھ آدمیوں کو آناً فاناً ہلاک کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور چیز Psittacosis Virus. ہے جو شہر کے شہر کو دم زدن میں موت کی نیند سلا سکتی ہے اور لطف یہ ہے کہ نہایت معمولی کارخانوں میں معمولی چیز سے طیار ہو سکتی ہے اور اس کے زہر سے نہ صرف انسان بلکہ حیوانات و نباتات بھی تباہ ہو سکتے ہیں — ایک طرف امریکہ ان طیاریوں میں مصروف ہے اور دوسری طرف روس فضائی شعاعوں - Gas mic Rays. کو مسخر کرنے کی فکر میں ہے تاکہ ان کی مدد سے وہ بستیوں کی بستیاں تباہ کر سکے اور اسی کے ساتھ آٹم بم بھی بڑی زبردست قوت کے طیار کر رہا ہے — یہی حال برطانیہ اور دوسرے ملکوں کا بھی ہے جنکی تمام علمی کوششیں صرف مہلک آلات کی ساخت میں صرف ہو رہی ہیں — آیندہ دنیا میں ایک اور جنگ کا ہونا بالکل یقینی ہے، اور اسی کے ساتھ یہ بھی اٹل حقیقت ہے کہ اس جنگ کے بعد کرۂ ارض بالکل تباہ ہو جائے گا اور اگر کچھ لوگ بچ رہے تو وہی ہوں گے جو اب بھی عہد وحشت کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

برطانیہ کے موجودہ اخبار

جنگ سے قبل لندن میں تیرہ اخبار (روزانہ) صبح کو شایع ہوتے تھے اور اب ان کی تعداد بارہ ہے شام کے اخبار صرف تین ہیں۔ ٹائمس، ڈیلی ورکر کے علاوہ لندن کے ان اخباروں کا ایک ڈیشن منچسٹر سے بھی شایع ہوتا ہے — جنگ سے قبل نو ہفتہ وار اخبار (ہر اتوار) کو شایع ہوتے تھے اور یہی تعداد اب بھی ہے۔

صبح کے اخباروں کی مجموعی اشاعت یہ ہے :

صبح کے اخبار :- ۱۵۵۷۴۹۷۸

شام کے اخبار :- ۳۴۹۰۶۰۶

ہفتہ وار :- ۲۲۳۴۴۷۷۷ — گویا کل ملا کر تقریباً دو کروڑ ستر لاکھ

بیرون لندن کے صوبہ جاتی اخباروں کی مجموعی اشاعت یہ ہے :

صبح کے اخبار :- ۳۰ لاکھ

شام کے اخبار :- ۶۰ لاکھ ۵۰ ہزار

اس طرح برطانیہ کے تمام اخباروں کی اشاعت کا اندازہ پانچ کروڑ ۶۰ لاکھ ہوتا ہے — ڈیلی ٹیلی گراف کی اشاعت ۲۸ء میں ۸۴۰۰۰۰ تھی، ۳۰ء میں ۲ لاکھ ہو گئی، جنگ کے دوران میں ساڑھے سات لاکھ ہو گئی اور اب دس لاکھ ۵ ہزار نو سو چالیس ہے — سنڈے ٹائمس کی اشاعت اسوقت ۵۵۶۷۰۳ اور آبزرور کی ۳۶۱۳۶۰ — ۳۸ء میں برطانیہ کے تمام اخباروں کے لئے ۱۲ لاکھ ٹن سالانہ کاغذ درکار ہوتا تھا۔

کلام دردِ سعیدی ٹونکی :

نگہ میں انجام جستجو ہے، قدم بھی آگے بڑھا رہا ہوں
نظر مقدر ہی پر نہیں ہے، خدا کو بھی آزما رہا ہوں

یہ کیوں فضا پر ہے یاس طاری، یہ ہر طرف کیوں اُداسیاں ہیں؟
ابھی تو اپنی تباہیوں پر میں آپ بھی مسکرا رہا ہوں

یہی نظامِ چمن رہا ہے، یہی نظامِ چمن رہے گا
وہیں قفس بھی بنے گا اک دن جہاں نشیمن بنا رہا ہوں

ہر شے پہ ہے اک سکوت طاری،
تخئیل میں ہے ابھی فسانہ!
مٹ جاتے ہیں سیکڑوں حقایق،
بنتا ہے کہیں جب اک فسانہ!

دل کی تباہیوں کا تو کچھ غم نہیں، مگر
شاید پھر آپ کا کوئی ارماں نہ کر سکے

آگیا صبر جیتے جی آخر
دل پر اک ایسی چوٹ بھی آئی
موت کی لے میں عشق نے اکثر
داستانِ حیات دُہرائی
قصۂ غم جہاں سے دُہرایا
عمر رفتہ وہیں سے لوٹ آئی

اکثر بیانِ غم میں اُلجھتے ہیں اس طرح
جیسے کہ اپنے حال سے ہوں بے خبر سے ہم

نگہِ جنوں نے ہزار ہا کئے چاک پردۂ آگہی
کوئی چیز پھر بھی چھپی ہوئی ہے ہنوز پردۂ راز میں

سر ہم نے جہاں جھکا دیا ہے
بندے کو خدا بنا دیا ہے

چمن میں ہوگی کسے عالمِ بہار کی قدر
قفس میں بیٹھ کے دیکھیں بہار کا عالم

جب تک ترا ستم نہ گوارا ہوا مجھے،
تیرا کرم بھی میرے لئے ناگوار تھا

بیخوابیِ غم اجل نہیں ہے،
مشکل ہی سے نیند آسکے گی،

میری ناکامیِ پیہم کی اُڑاؤ نہ ہنسی
دل کا انداز حریفانہ ہوا جاتا ہے

محبت کی تو منزل ہی نہیں ہوتی کوئی لیکن
بنا لیتی ہے لاکھوں منزلیں در ماندگی اپنی

کلام سرشار صدیقی :

مرا حال تو نے پوچھا، یہ کرم بھی کم نہیں ہے
تری پرسشوں کے صدقے مجھے کوئی غم نہیں ہے

چشم گریاں کی قسم میں نے خزاں میں اکثر
اپنے دامن میں گلستاں کا گلستاں دیکھا

کہدو ابھی نہ کروٹیں بدلے نظام دہر
میری جبینِ شوق ہے اور پائے یار ہے

بیخودی دیتی ہے جب دل کو پیامِ خلوت
تو خدا جانے اس عالم میں کہاں ہوتا ہے،

حجابِ دیر و حرم میں اُلجھ گئیں نظریں
کچھ اور بڑھتے تو بس ان کا آستانہ تھا

مہاتما گاندھی

لازوال اک ٹیس ہے سینوں میں غم ہے مستقل
بھیگتی جاتی ہیں آنکھیں ڈوبتے جاتے ہیں دل

جگمگاتے دیش کی برباد شوبھا ہوگئی
ناگہاں کوئی سُہاگن جیسے بیوہ ہوگئی

زندگی دیکر وطن کو سب کا پیارا اُٹھ گیا
بے کسوں کا نیک لوگوں کا سہارا اُٹھ گیا

ہائے یہ کیا ہو رہا ہے ہائے یہ کیا ہوگیا
ہند کا باپو زمانے کو جگا کر سو گیا،

صبر بھی آجائے گا۔ یہ زخم بھی بھر جائے گا
ہند ایسا دیوتا لیکن کہاں سے لائے گا

خواب تک میں بھی خیال اس بات کا آتا نہ تھا
شانتی کا دیوتا گولی سے مارا جائے گا

پانی پانی کرگئی سب کو یہ ذلت ناک بات
کیوں اُٹھا کس طرح اُٹھا۔ باپ پر بیٹے کا ہاتھ

اک اُجالا تھا کہ جس کے دم سے روشن تھا یہ گھر
کیا ملا پاپی کو سارے دیش کا سکھ چھین کر

ظلمتوں کے خوف سے سورج ٹھہر سکتا نہیں
مرگیا پیغام بر - پیغام مر سکتا نہیں

ادیب سہارنپوری

آزادی کا خواب

کتنے بے تعبیر ٹھہرے امن و آزادی کے خواب
کس قدر نزدیک نکلی آرزؤں کی سراب

موت کے طوفان میں کتنے سفینے بہہ گئے
کتنے سورج چھپ گئے اور چاند کتنے گہہ گئے

کتنے لاشے تھے کہ بے گور و کفن پائے گئے
کتنے دل چھیدے گئے اور کتنے سر کاٹے گئے

فطرتِ انسان اس درجہ جنونی ہوگئی،
کتنی مائیں ہیں کہ جن کی گود سونی ہوگئی

کتنے دامن چاک ہیں کتنے گریباں بے رفو
بستیوں میں لُٹ گئی انسانیت کی آبرو

نفرت و دہشت کی سالاری میں ہر سو ہیں رواں
خانماں برباد و انساں کارواں در کارواں

نورِ آزادی کو نفرت کا اندھیرا کھا گیا،
سانس بھی لینے نہ پائے تھے کہ طوفاں آگیا

ادیب سہارنپوری

کلام عرشی بھوپالی :

وہ ہم سے خفا تو ہیں لیکن آیا نہ خفا ہونا بھی انھیں
احباب نے ان کی نظروں کو سو بار پریشاں دیکھا ہے

اب کہئے تو ان سے کیا کہئے کچھ یاد نہیں سب بھول گئے
دامن تو یہ کہہ کر تھاما تھا کچھ آپ سے ہم کو کہنا ہے،

تجدیدِ کرم سر آنکھوں پر، یہ دولتِ غم تو مجھ سے نہ لے
کچھ اور سنورنا ہے مجھ کو کچھ اور ابھی مجھ کو جینا ہے،

تجدیدِ آرزو کے لئے دل مچل نہ جائے
مدّت کے بعد پھر وہ نظر آگئے ہیں آج

شاید انھیں بھی رنجشِ باہم ہے ناگوار
مجھ سے نگاہ ملتے ہی گھبرا گئے ہیں آج

اب دیکھئے پہونچتی ہیں بربادیاں کہاں
اُن کی حسین آنکھوں میں اشک آگئے ہیں آج

کلام خزاں پریمی :

کسی کی یہ ادا کتنی بھلی معلوم ہوتی ہے
نظر اُٹھتی نہیں - اُٹھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے

چھلک پڑا ہے مرا ساغرِ حیات خزاں
بہار آئے نہ آئے - اب انتظار نہیں

وہی آپ کا تصور - وہی اشک کی روانی
یونہی بجھ گئیں امنگیں - یونہی مٹ گئی جوانی

یہ میں نے مانا کہ آج ہر شے پہ زندگی کا نکھار سا ہے،
نہ جانے کیوں یہ حسین منظر مری نگاہوں پہ بار سا ہے

رہِ طلب میں جو منزل کو زندگی جانے
خدا کرے کہ وہ منزل کبھی نہ پہچانے

چلو آج جی بھر کے آنسو بہا لیں،
یہ تاروں بھری رات آئے نہ آئے

غم ایک امتحان تھا انسان کے لئے
جو لوگ اہلِ ذوق تھے - وہ مسکرا دئے

کلام رسا بریلوی :

تکمیلِ ذوقِ سعیِ تماشا کریں گے ہم
ان کو نگاہِ شوق سے دیکھا کریں گے ہم

آغاز ہی میں لٹ گیا سرمایۂ نشاط
انجامِ آرزو پہ نظر کیا کریں گے ہم

راحت رساں ہے عشق میں ہر کاوشِ حیات
کیوں تم سے التجائے مداوا کریں گے ہم

مطبوعات موصولہ

ہم وحشی ہیں مجموعہ ہے کرشن چندر کے چھ مختصر افسانوں کا، جو پاکستان و ہندوستان کے موجودہ اختلافات اور ہندو مسلمانوں کی باہمی خونریزی و سفاکی کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں۔

کرشن چندر بہت مشہور فسانہ نگار ہیں اور اس وقت تک وہ بہت سے فسانے لکھ چکے ہیں، لیکن ان افسانوں کو لکھ کر انھوں نے جو خدمت انجام دی ہے وہ یقیناً غیر فانی ہے۔ انھوں نے ان افسانوں میں ہندو مسلمانوں کے مظالم کی ایسی تصویر پیش کی ہے جس کو دیکھ کر دل ہل جاتا ہے اور ہمارے وہ جذبات حرکت میں آجاتے ہیں جن کا تعلق سچے اعترافِ گناہ سے ہے اور غالباً اس مجموعہ کی اشاعت کا مقصود بھی یہی ہے۔

ابتدا میں سردار جعفری کا دیباچہ بھی شامل ہے جو بجائے خود پڑھنے اور سمجھنے کی چیز ہے۔ کتابت و طباعت وغیرہ نہایت پاکیزہ۔ حجم ۱۲۰ صفحات۔ قیمت ۴ عہ۔ ملنے کا پتہ: کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی۔

بہار اور اُردو شاعری تذکرہ ہے صوبۂ بہار کے اُردو شاعروں کا جسے پروفیسر محمد معین الدین دردانی نے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب کی بنیاد وہ مقالہ ہے جو اس موضوع پر ۳۶ء میں مولف نے دورانِ تعلیم (مسلم یونیورسٹی) میں مرتب کیا تھا۔ یہ مقالہ پہلے سہیل میں شایع ہوا، پھر معاصر میں اور اب مزید اضافہ و ترمیم کے بعد کتابی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

صوبۂ بہار نے اُردو کے نشو و نما اور شعراء اُردو کی قدر افزائی میں جتنا حصہ لیا وہ اہلِ علم سے مخفی نہیں اور پھر یہ کہ متقدمین میں بیدلؔ اور متاخرین میں شادؔ اسی سرزمین سے تعلق رکھتے تھے، بجائے خود اتنی بڑی نسبت ہے کہ بہار اس پر جتنا ناز کرے کم ہے۔

فاضل مولف نے اس کی ترتیب میں کافی کاوش و محنت سے کام لیا ہے اور علاوہ متداول تذکروں کے مشہور کتب خانوں کی بھی چھان بین کی ہے، چنانچہ اس تذکرہ میں بعض ایسے شعراء متقدمین کے نام بھی نظر آتے ہیں جن سے لوگ واقف نہیں ہیں مختصر حالات کے ساتھ کلام کا انتخاب بھی درج کیا گیا ہے اور بیدلؔ سے لیکر عہد حاضر تک کے تمام مشہور و غیر مشہور شاعروں کا ذکر اس میں موجود ہے۔ ابتداء میں پروفیسر اختر اورینوی کا پیش لفظ ہے اور اسکے بعد مولف کا لکھا ہوا دیباچہ اور دونوں بہت

دلچسپ ہیں۔

طباعت و کتابت اچھی ہے اور کاغذ نفیس۔ حجم ۱۶۶ صفحات۔ قیمت ۴؎۔ ملنے کا پتہ:۔ اسلامیہ بک ڈپو آرہ۔

ہندوستان کی قومی زبان اور رسم الخط

یہ تصنیف بھی پروفیسر محمد معین الدین دردائی کی ہے جس میں موضوع کے لحاظ سے بڑا دلچسپ اور کار آمد مواد پیش کیا گیا ہے۔ ۱۹۴۰ء میں مولف ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے دہلی میں کام کر رہے تھے اور وہیں مولوی عبدالحق صاحب کے ایما سے انھوں نے اُردو ہندی نزاع کی تاریخ سے متعلق معلومات فراہم کرنا شروع کیں، جواب کتاب کی صورت میں پیش کی گئی ہیں۔

فاضل مصنف نے اس کتاب میں سب سے پہلے یہ بتایا ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے یہاں کون سا رسم الخط رائج تھا اور پھر اس کے بعد فارسی رسم خط نے کیونکر رواج پایا، اس کے بعد نفس مسئلہ زبان پر گفتگو کرکے بتایا ہے کہ اُردو کیونکر مقبول ہوئی اور اس نے کتنی وسعت اختیار کی اور پھر اُردو ادب کی ترقی پر مختصر سا تبصرہ کرکے رسم خط کی بحث شروع کی ہے جو واقعی کافی معلومات رکھتی ہے۔

فاضل مصنف نے اس بحث کے سلسلہ میں بتایا ہے کہ اُردو رسم خط کی کیا اصلیت ہے اس میں کیا خوبیاں ہیں اور بین الاقوامی نقطۂ نظر سے اس کی کیا حیثیت ہے۔ دیوناگری رسم خط کا مقابلہ کرتے ہوئے انھوں نے تمام اعتراضات کا جواب دیا ہے جو اُردو رسم خط پر کئے جاتے ہیں اور اعداد و شمار اور متعدد نقشوں سے اپنے دعوے کے ثبوت پیش کئے ہیں۔ اُردو ہندی نزاع سے دلچسپی لینے والوں کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے اور ہمیں امید ہے کہ ملک مصنف کی محنت و کاوش کی قدر کرے گی۔ قیمت ۴؎۔ ملنے کا پتہ: اسلامیہ بک ڈپو آرہ

منتخبات غالب

مجموعہ ہے میرزا نوشہ کے غیر مطبوعہ فارسی مکتوبات و منظومات کا جسے پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی نے مرتب کیا ہے۔ پہلے حصہ میں مکتوبات درج ہیں جن کی تعداد ۴۹ ہے اور جو مولوی سراج الدین احمد، مرزا احمد بیگ خاں، مرزا ابوالقاسم خاں، ناسخ اور ادارۂ جام جہاں نما کے نام غالب نے لکھے تھے۔ دوسرے حصہ میں ایک غزل، تین قطعے، ایک مثنوی اور ایک سلام ہے۔

اس مجموعہ میں سب سے زیادہ اہم وہ مثنوی ہے جس کے متعلق مولانا حالی کو بھی غلط فہمی ہوئی تھی۔ فاضل مرتب نے ابتداً میں ان تمام خطوط اور قطعات وغیرہ پر ایک تبصرہ بھی کیا ہے جو بجائے خود ایک مقالہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے اور کتب خانہ ریاست رام پور نے اسے شایع کیا ہے۔ ضخامت ۱۸۶ صفحات، قیمت ۴؎

ناول کی تاریخ اور تنقید

تصنیف ہے سید علی عباس حسینی ام۔ اے کی جسے انڈین بک ڈپو لکھنؤ سے شایع کیا ہے۔ اس موضوع پر اُردو میں یہ بالکل پہلی کتاب ہے، لیکن ابتدائی کوششوں کی طرح تشنہ و ناکام نہیں۔ فاضل مصنف نے اس کتاب کو دس ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں قصوں کی ابتدا پر بحث کرتے ہوئے یہ بھی بتایا ہے کہ ان پر مذہب

فلسفہ اور نفسیات کا کیا اثر پڑا - دوسرے باب میں ناول کے اقسام اور اس کے عناصر ترکیبی سے عمومی بحث کی گئی ہے تیسرے باب میں جو کافی طویل ہے انگریزی ناولوں کے نشو و ارتقا کا ذکر ہے، چوتھا باب اُردو کے ابتدائی قصوں سے لیکر حالی اور نذیر احمد کی تصانیف تک حاوی ہے، پانچویں باب میں رتن ناتھ سرشار اور چھٹے باب میں شرر اور محمد علی طبیب، ناولوں کا ذکر ہے - ساتویں باب میں سجاد حسین، مرزا عباس حسین ہوش، مرزا رسوا اور مولانا راشد الخیری کی تصانیف پر گفتگو کی گئی ہے، آٹھواں باب پریم چند کے لئے مخصوص ہے، نویں باب میں اور دوسرے ناول نویسوں کا ذکر ہے اور دسویں میں ترقی پسند نظریہ کو سامنے رکھکر اُردو ناول کے مستقبل پر اظہار خیال کیا گیا ہے -

یہ کتاب ۴۵۰ صفحات کو محیط ہے اور اس میں کلام نہیں کہ فاضل مصنف نے اس کی جمع و ترتیب میں بڑی محنت و کاوش سے کام لیا ہے اور وہ اس موضوع پر اپنے ریسرچ میں بہت کامیاب ہوئے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ ایک نقص تو یہ ہے کہ کتابت کی غلطیاں کثرت سے ہیں جو طویل غلط نامہ لگانے کے بعد بھی باقی رہ جاتی ہیں اور دوسرا اس سے بڑا نقص یہ ہے کہ جو زبان مصنف نے اس میں استعمال کی ہے وہ ایک علمی یا تاریخی تصنیف کے لئے ناموزوں ہے، انھوں نے آزاد کے آب حیات کا تتبع کیا ہے اور یہ رنگ عہد حاضر میں بالکل نامطبوع خیال کیا جاتا ہے - کیا اچھا ہوتا اگر یہ تصنیف اس سبکی و خامی سے پاک ہوتی -

اس کی قیمت چھ روپیہ ہے، جو تصنیف کی اہمیت کے لحاظ سے کچھ بھی نہیں ہے -

ملکۂ مشرق تصنیف ہے محترمہ محمودہ رضویہ کی، جس کو کراچی کی ڈائرکٹری کہنا زیادہ موزوں ہوگا - اس کتاب میں فاضل مصنفہ نے سب سے پہلے سندھ کی تاریخ سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ سندھ میں مسلمانوں کی آمد کس طرح ہوئی اور ان کی حکومت کیونکر ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں منتقل ہوتی رہی اس کے بعد انگریزی عہد کو لیا ہے اور پھر قیام پاکستان کا ذکر کرکے کراچی کے موجودہ کوائف و حالات سے بحث کی ہے -

محمودہ رضویہ بہت مشاق لکھنے والی ہیں اور ان کی متعدد تصانیف اس سے قبل شایع ہو چکی ہیں - امید ہے کہ یہ کتاب اہل علم میں مقبول ہوگی - قیمت ۸؎ - ملنے کا پتہ: محمودہ رضویہ حافظ شریف حسین ڈی، ڈی چودھری روڈ - کراچی -

اُجالے اندھیرے مجموعہ ہے جناب ساحلی احسانی کی ۸۲ نظموں اور غزلوں کا جن میں چھوٹی سی چھوٹی نظم دو شعر کی ہے اور بڑی سی بڑی بارہ پندرہ اشعار سے زیادہ نہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ساحلی صاحب اپنے مقصود کو مختصر الفاظ میں بیان کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں - غزلوں کا رنگ بھی زیادہ تر نظم ہی کا سا ہے اور اس لئے غزلوں کی سرخیاں بھی انھوں نے قایم کر دی ہیں -

ساحلی صاحب، ۲۴ سال کے ایک نوجوان شاعر ہیں اور ان کی مشق سخن بھی دو سال سے زیادہ نہیں، لیکن باوجود اس کمسنی اور کم مشقی کے ان کے کلام میں بہت جان پائی جاتی ہے اور ایک اچھے شاعر بننے کی ان میں بڑی صلاحیت پائی جاتی ہے -

قیمت ۸؎ - ملنے کا پتہ: ایوان ادب ۱۳، عبداللہ بلڈنگ ۲، پریل، بمبئی -

اثر کے تنقیدی مضامین

مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے چودہ تنقیدی مضامین جو ملک کے مشہور رسایل و جراید میں اس سے قبل شایع ہو چکے تھے اب اس نام سے کتابی صورت میں شایع کئے گئے ہیں۔

اثر صاحب اول اول ایک شاعر کی حیثیت سے رونما ہوئے تھے، لیکن جب ان کی شاعری پورے عروج و کمال کو پہونچ گئی تو انھوں نے تنقید کی طرف بھی توجہ کی اور چونکہ یہ مشغلہ انھوں نے فن شعر میں پختہ کار ہونے کے بعد اختیار کیا تھا، اس لئے وہ اس فن میں بھی بہت جلد کامیاب ہو گئے۔

اس مجموعہ میں اقبال، جوش، ثاقب، مومن وغیرہ کے کلام پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے جس سے نقاد کی طبع وقاد کا پورا پتہ چلتا ہے۔ طباعت و کتابت بہت صاف ہے، لیکن اغلاط سے پاک نہیں۔

ضخامت ۱۷۶ صفحات۔ ملنے کا پتہ: نظامی پریس۔ بدایوں۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے۔

محل

مجموعہ ہے ہندوستان کی نو مشہور خواتین کے اُردو افسانوں کا جن کا انتخاب خود انھیں خواتین نے کیا ہے۔ ان خواتین میں خاص خاص یہ ہیں: عصمت شاہد لطیف۔ حجاب امتیاز علی۔ ڈاکٹر رشید جہاں۔ خدیجہ مستور۔

یہ مجموعہ بھی نظامی پریس بدایوں نے شایع کیا ہے۔ ضخامت ۲۵۶ صفحات۔ قیمت تین روپیہ۔

مارچ ۱۹۴۸ء میں!

"افکار"

کا

خاص نمبر

شائع ہو رہا ہے!!

-: ادارہ :-

صہبا رشدی

خاص نمبر۔ میں اُردو کے مستقبل سے متعلق اُردو کانفرنس لکھنؤ کی اہم تجاویز، اُس کے تاریخی فیصلوں اور تعمیری اقدامات پر تفصیلی روشنی ڈالی جائے گی۔

خاص نمبر۔ کے لئے جن بلند پایہ ہستیوں کے پیغامات موصول ہو چکے ہیں اُن کے نام یہ ہیں:۔

مہاتما گاندھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو۔ مسز سروجنی نائڈو۔ سر تیج بہادر سپرو۔ پی۔ سی جوشی

خاص نمبر۔ کو اسوقت تک تمام چوٹی کے فنکاروں کا تعاون حاصل ہو چکا ہے۔ مثلاً: نیاز فتحپوری۔ قاضی عبدالغفار۔ ڈاکٹر سید محمود۔ جوش ملیح آبادی۔ جگر مراد آبادی۔ حسرت موہانی۔ اثر لکھنوی۔ فراق گورکھپوری۔ سجاد ظہیر۔ کرشن چندر۔ احتشام حسین۔ آل احمد سرور وغیرہ

خاص نمبر۔ سفید چکنے کاغذ پر آرٹسٹک کور اور پورے اشاعتی حسن کے ساتھ تقریباً سوا سو صفحات پر شایع ہو رہا ہے۔

قیمت خاص نمبر صرف عہ (ایک روپیہ)

ایجنٹ اور مشتہرین حضرات جلد توجہ فرمائیں ——— منیجر "افکار" بھوپال

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنہ، علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں :-

۱ چند گمشدہ فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

۲ مادیین کا مذہب

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوشخط سرورق رنگین

قیمت بارہ آنے علاوہ محصول

فراست الید

مولفۂ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری شہرت و ننگ نامی پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنے حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے، ایک بار اس کو شروع کردینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت ڈیڑھ روپیہ

علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان طریقت و علماء کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کے لئے کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ و انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

انتقادیات (دو حصے)

حضرت نیاز فتحپوری کے انتقادی مقالات جو دو حصوں میں تقسیم کئے گئے ہیں، پہلے حصہ میں وہ مقالات ہیں جن میں خاص خاص شعراء کے کلام پر تنقید کی گئی ہے، مثلاً :- مومن، ظفر غالب، مصحفی، نظیر، سیماب، جوشش اصغر وغیرہ وغیرہ، دوسرے حصہ میں عام ادبی و انتقادی مباحث ہیں جن کا تعلق شعر و ادب کی تاریخ سے ہے۔

قیمت حصۂ اول للعہر۔ حصۂ دوم للعہ

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور یہ دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔

اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنے رکھتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کردینے والی

انجیلِ انسانیت

"من و یزداں"

مولانا نیاز فتحپوری کی ۲۰ سالہ دورِ تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ۔ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کرکے تمام نوعِ انسانی کو وحدتِ عالم کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے — اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقاید و رسالت کے مفہوم اور صحایف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی و نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پُر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے ——— ضخامت ۴۷۲ صفحات۔ مجلد۔ قیمت سات روپیہ آٹھ آنہ

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶ "نگار" بک ایجنسی لکھنؤ

"نگار" کے خاص نمبر

جنوری سنہ ۳۹ء
(مصحفی نمبر)
اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:- حیات مصحفی - اُردو غزلگوئی میں مصحفی کا مرتبہ - مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں، انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ
قیمت دو روپیہ، علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۰ء
(نظیر نمبر)
اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:- نظیر کا مسلک شاعری پر تبصرہ - نظیر اور عوام - انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۱ء
یہ نمبر دنیائے تذکرہ میں بالکل پہلی چیز ہے - یعنی اس وقت کے تمام مشہور غزل گو شعراء نے خود اپنے حالات لکھے ہیں اور خود اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے -
قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۲ء
اس نمبر میں ملک کے پانچ مشہور نقادوں نے اُن شاعروں کے کلام پر تبصرہ کیا ہے جن کی غزلوں کا انتخاب جنوری سنہ ۴۱ء میں شایع ہوا تھا -
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۳ء
اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی -
قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۵ء
(قرآن نمبر) اس میں ڈاکٹر اسپرنگر کے اُن اعتراضات کو پیش کیا گیا ہے جو ماخذ القرآن کے عنوان سے کئے گئے ہیں - حضرت نیاز کے فٹ نوٹ اور استدراک کے ساتھ ——— قیمت دو روپیہ علاوہ محصول -

جنوری - فروری مارچ سنہ ۴۶ء
یہ سالنامہ دو حصّوں میں شایع ہوا ہے اور فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے - پہلا حصّہ جنوری کا ہے اور دوسرے حصّہ میں فروری، مارچ دونوں نمبر شامل ہیں - قیمت ہر حصّہ کی ایک روپیہ آٹھ آنے

جنوری سنہ ۴۷ء
اس سالنامہ کا نام "ماجدولین نمبر" ہے جس میں ایک بے مثل فرانسیسی ادیب کی ایک شاہکار ٹریجڈی کو اُردو میں منتقل کیا گیا ہے - ادبیت و جذبات نگاری کے لحاظ سے یہ ناول اپنا نظیر نہیں رکھتا ——— قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے - علاوہ محصول -

جنوری، فروری سنہ ۴۸ء
(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دُنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقایق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دُور رس اور اُن کارناموں کو نہ بھول جائے جن پر مسلم حکومتوں کی ترقی کی بنیاد قایم ہوئی تھی - تمام مقالات اڈیٹر کے قلم کے ہیں ——— قیمت تین روپیہ ——— علاوہ محصول -

نرخنامہ اُجرت اشتہار

ایک سال	چھ ماہ	تین ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ ۶۰۰ روپیہ	۳۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۵۰ روپیہ
آدھ صفحہ ۳۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۷۵ روپیہ	۲۵ روپیہ
چوتھائی صفحہ ۱۵۰ روپیہ	۷۵ روپیہ	۴۰ روپیہ	۱۴ روپیہ

کمیشن وغیرہ کی مزید تفصیلات اور قواعد طلب کیجئے - "منیجر"

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر چھ روپیہ - ششماہی جاری نہیں ہو سکتا - سالانہ بیرون ہند بارہ روپیہ

(نوٹ) رسالہ بہر ماہ کی ۱۰ تاریخ تک شایع ہوتا ہے اور ۱۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے ورنہ پھر کسی طرح نہیں مل سکتا - "منیجر"

جواب کیلئے ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے اور خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے

مطبوعہ مختار پرنٹنگ ورکس لکھنؤ (پرنٹر و پبلشر:- ایس حسین)